الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

دوسروں کی شکایت کرنا اکثر حالات میں ——
صرف اپنی نااہلی کا اعتراف ہوتا ہے

جون ۱۹۸۶
شمارہ ۱۱۵

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچّا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۵ جون ۱۹۸۶

فہرست

روزہ اور کردار	صفحہ ۲	اقدام سے پہلے	صفحہ ۹
شہد کا سبق	۳	ایک تجربہ	۱۱
درخت	۴	مستقبل پکار رہا ہے	۱۶
قدرت کا نظام	۵	اردو صحافت اور اخلاقیات	۱۸
دعوتی امکان	۶	ایک سفر	۳۱
تصویر ملت	۷	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۳
غصہ اور کبر	۸	ایک گزارش	۴۷

روزہ اور کردار

مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (رواہ البخاری)

جس روزہ دار نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور اپنا پینا چھوڑ دے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کی عبادت کی قیمت اس وقت ہے جب کہ اس کے ساتھ وہ جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا چھوڑے ہوئے ہو۔ جو شخص اس طرح عبادت کرے کہ عبادت گزاری کے ساتھ وہ جھوٹ بولتا ہو اور جھوٹ پر عمل کرتا ہو تو اس کی عبادت گزاری اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں ٹھہرے گی۔ اللہ کو بے جھوٹ کا عمل مطلوب ہے نہ کہ وہ عمل جس کے ساتھ جھوٹ شامل ہو۔

اس حدیث میں دو لفظ آئے ہیں۔ ایک ہے جھوٹ بولنا۔ دوسرے جھوٹ پر عمل کرنا۔ جھوٹ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی گفتگو میں اِس کی پابندی نہ کرتا ہو کہ وہ ہمیشہ مطابق واقعہ بات کہے۔ اور جو بات واقعہ کے مطابق نہ ہو اس کو اپنی زبان سے نہ نکالے۔ تاہم صرف وہی شخص جھوٹا نہیں ہے جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہو، جو پہلے سے طے کیے ہوئے ذہن کے مطابق جھوٹی بات کہے۔ حدیث کے مطابق وہ شخص بھی جھوٹا ہے جو خود ارادہ کرکے جھوٹ نہ بولے، مگر وہ ایسی بات کہے جو عملاً ایک جھوٹی بات ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سنی ہوئی بات کو بلا تحقیق دہرانا بھی جھوٹ ہے:

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اس کو بیان کرنے لگے۔

جھوٹ پر عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی جھوٹ کو اپنے عمل کی بنیاد بنائے۔ وہ جھوٹا نعرہ کھڑا کرکے قوم کے اوپر لیڈری حاصل کرے۔ وہ ایک بے بنیاد قصہ گھڑ کر اس کے ذریعہ کسی بندۂ خدا کو بدنام کرے۔ وہ جھوٹی دستاویز تیار کرکے کسی کی جائداد کو اپنی جائداد بنائے۔ وہ فرضی تقریریں کرکے عوام کے درمیان مقبولیت حاصل کرے۔ وہ موجودہ دنیا میں جھوٹ کی بنیاد پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے نہ کہ سچ کی بنیاد پر۔

شہد کا سبق

شہد کی مکھیاں پھولوں کا جو رس جمع کرتی ہیں وہ سب کا سب شہد نہیں ہوتا۔ اس کا صرف ایک تہائی حصہ شہد بنتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کو ایک پونڈ شہد کے لیے ۲۰ لاکھ پھولوں کا رس حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے مکھیاں تقریباً ۳۰ لاکھ اڑانیں کرتی ہیں۔ اور اس دوران میں وہ مجموعی طور پر ۵۰ ہزار میل تک کی مسافت طے کرتی ہیں۔ رس جب مطلوبہ مقدار میں جمع ہو جاتا ہے تو اس کے بعد شہد سازی کا عمل شروع ہوتا ہے۔

شہد اپنے ابتدائی مرحلہ میں پانی کی طرح رقیق ہوتا ہے۔ شہد تیار کرنے والی مکھیاں اپنے پروں کو پنکھے کی طرح استعمال کر کے فاضل پانی کو بھاپ کی مانند اڑا دیتی ہیں۔ جب یہ پانی اڑ جاتا ہے تو اس کے بعد ایک میٹھا سیال باقی رہ جاتا ہے جس کو مکھیاں چوس لیتی ہیں۔ مکھیوں کے مُنھ میں ایسے غدود ہوتے ہیں جو اپنے عمل سے اس میٹھے سیال مادہ کو شہد میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اب مکھیاں اس تیار شہد کو چھتے کے مخصوص طور پر بنے ہوئے سوراخوں میں بھر دیتی ہیں۔ یہ سوراخ دوسری مکھیاں موم کے ذریعہ حد درجہ کاریگری کے ساتھ بناتی ہیں۔ مکھیاں شہد کو ان سوراخوں میں بھر کر اس کو "ڈبہ بند" غذا کی طرح اہتمام کے ساتھ محفوظ کر دیتی ہیں تاکہ آیندہ وہ انسان کے کام آسکے۔

اس طرح کے بے شمار اہتمام ہیں جو شہد کی تیاری میں کیے جاتے ہیں۔ خدا ایسا کر سکتا تھا کہ طلسماتی طور پر اچانک شہد پیدا کر دے یا پانی کی طرح شہد کا چشمہ زمین پر بہا دے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ خدا ہر قسم کی قدرت کے باوجود شہد کو اسباب کے ایک حد درجہ کامل نظام کے تحت تیار کرتا ہے۔ تاکہ انسان کو سبق ہو۔ وہ جانے کہ خدا نے دنیا کا نظام کس ڈھنگ پر بنایا ہے اور کن قوانین و آداب کی پیروی کر کے خدا کی اس دنیا میں کوئی شخص کامیاب ہو سکتا ہے۔

شہد کی مکھی جس طرح عمل کرتی ہے اس کو ایک لفظ میں، منصوبہ بند عمل کہہ سکتے ہیں۔ یہی اصول انسان کے لیے بھی ہے۔ انسان بھی صرف اس وقت کوئی بامعنی کامیابی حاصل کر سکتا ہے جب کہ وہ منصوبہ بند عمل کے ذریعہ اپنے مقصد تک پہونچنے کی کوشش کرے۔ منظم اور منصوبہ بند عمل ہی اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا واحد یقینی طریقہ ہے، شہد کی مکھی کے لیے بھی اور انسان کے لیے بھی۔

درخت

درخت کا ایک حصہ تنہ ہوتا ہے اور دوسرا حصہ اس کی جڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ درخت کا جتنا حصہ اوپر ہوتا ہے تقریباً اتنا ہی حصہ زمین کے نیچے جڑ کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ درخت اپنے وجود کے نصف حصہ کو سرسبز و شاداب حقیقت کے طور پر اس وقت کھڑا کر پاتا ہے جب کہ وہ اپنے وجود کے بقیہ نصف حصہ کو زمین کے نیچے دفن کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ درخت کا یہ نمونہ انسانی زندگی کے لیے خدا کا سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی تعمیر اور استحکام کے لیے لوگوں کو کیا کرنا چاہیے۔ ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے :

> Root downward — fruit upward. That is the divine protocol. The rose comes to perfect combination of colour, line and aroma atop a tall stem. Its perfection is achieved, however, because first a root went down into the homely matrix of the common earth. Those who till the soil or garden understand the analogy. Our interests have so centred on gathering the fruit that it has been easy to forget the cultivation of the root. We cannot really prosper and have plenty without first rooting in a life of sharing. The horn of plenty does not stay full unless first there is rooting in sharing.

جڑ نیچے کی طرف، پھل اوپر کی طرف۔ یہ خدائی اصول ہے۔ گلاب کا پھول رنگ اور خوشبو کا ایک معیاری مجموعہ ہے جو ایک تنہ کے اوپر ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس کا معیار اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ پہلے ایک جڑ نیچے مٹی کے اندر گئی۔ وہ لوگ جو زمین میں کھیتی کرتے ہیں یا باغ لگاتے ہیں وہ اس اصول کو جانتے ہیں۔ مگر ہم کو پھل حاصل کرنے سے اتنی زیادہ دلچسپی ہے کہ ہم جڑ جمانے کی بات آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ ہم حقیقی ترقی اور خوش حالی حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم مشترک زندگی میں اپنی جڑیں داخل نہ کریں۔ مکمل خوش حالی مشترک زندگی میں جڑیں قائم کیے بغیر ممکن نہیں۔

درخت زمین کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ مگر وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں جماتا ہے۔ وہ نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتا ہے نہ کہ اوپر سے نیچے کی طرف۔ درخت گویا قدرت کا معلّم ہے جو انسان کو یہ سبق دے رہا ہے : اس دنیا میں داخلی استحکام کے بغیر خارجی ترقی ممکن نہیں۔

قدرت کا نظام

اگر آپ اپنا کمرہ بند کر کے باہر چلے جائیں اور چند مہینہ کے بعد واپس آکر اسے کھولیں تو ہر طرف اتنی گرد پڑی ہوئی ہو گی کہ جب تک آپ اسے صاف نہ کر لیں آپ اس کمرہ میں بیٹھنا پسند نہ کریں گے۔ تیز ہوا کے ساتھ جب گرد اٹھتی ہے تو آدمی سخت پریشان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ کب یہ گرد کی آفت اس سے دور ہو جائے۔

لیکن گرد کیا ہے۔ یہ زمین کی اوپری سطح کی وہ زرخیز مٹی ہے جس سے ہر قسم کی سبزیاں، پھل اور غلّے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر زمین کی سطح پر یہ مٹی نہ ہو تو زمین پر زندگی گزارنا آدمی کے لیے ناممکن ہو جائے۔

پھر یہی گرد ہے جو فضا میں کثافت پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے پانی کے بخارات بادل کی صورت اختیار کرتے ہیں اور بوند بوند کر کے زمین پر برستے ہیں۔ زمین کی اوپری فضا میں گرد نہ ہو تو بارش کا عمل ختم ہو جائے۔

سورج نکلنے اور ڈوبنے کے وقت جو رنگین شفق آسمان کے کناروں پر دکھائی دیتی ہے وہ بھی فضا میں اسی گرد کی موجودگی کی وجہ سے ہے۔ گرد ہمارے لیے ایک مفید مادہ بھی ہے اور ہماری دنیا کو خوش منظر بنانے کا ذریعہ بھی۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں کس طرح خدا نے ناخوش گوار چیزوں کے ساتھ خوش گوار چیزیں رکھ دی ہیں۔ جس طرح پھول کے ساتھ کانٹا ہوتا ہے اسی طرح زندگی میں پسندیدہ چیزوں کے ساتھ ناپسندیدہ چیزوں کا جوڑا بھی لگا ہوا ہے۔

اب جب کہ خود قدرت نے پھول اور کانٹے کو ایک ساتھ پیدا کیا ہے تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم اس کے ساتھ نباہ کی صورت پیدا کریں۔ موجودہ دنیا میں اس کے سوا کچھ اور ہونا ممکن نہیں۔

دوسروں کی شکایت کرنا صرف اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ یہ دنیا اس ڈھنگ پر بنائی گئی ہے کہ یہاں لازماً شکایت کے مواقع آئیں گے۔ عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو بھول جائے۔ وہ شکایت کو نظر انداز کر کے اپنے مقصد کی طرف اپنا سفر جاری رکھے۔

دعوتی امکان

فرانس کے ڈاکٹر جرینیہ نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ میں ان کے بارہ میں حسب ذیل رپورٹ شائع ہوئی ہے:

انني تتبعت كل الآيات القرآنية التي لها ارتباط بالعلوم الطبية والصحية والطبيعية التي درستها من صغري واعرفها جيدا فوجدت هذه الآيات منطبقة كل الانطباق على معارفنا الحديثة .. لقد اسلمت لانني تيقنت ان محمدا صلى الله عليه وسلم اتى بالحق الصراح من قبل الف سنة دون معلم او مدرس من البشر ولو ان كل صاحب فن من الفنون او علم من العلوم قارن كل الآيات القرآنية المرتبطة بما يعلم كما فعلت انا لاسلم بلا شك ان كان عاقلا خاليا من الاغراض ـ (الدعوة، الرياض ۹ دسمبر ۸۵ء)

میں نے قرآن کی ان تمام آیات کا تتبع کیا جن کا تعلق مختلف طبیعیاتی علوم سے ہے، جن کو میں نے کم عمری سے پڑھا ہے اور جن کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے پایا کہ قرآن کی یہ آیتیں ہماری جدید معلومات سے کلی مطابقت رکھتی ہیں۔ میں نے اسلام قبول کرلیا کیوں کہ مجھے یقین ہوگیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق لے کر آئے۔ وہ ہزار سال پہلے پیدا ہوئے انھوں نے کسی استاد سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ پھر بھی ان کی ہر بات بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اور اگر علوم کے ماہرین یہ کریں کہ وہ قرآن کی آیتوں کا اپنی معلومات سے مقابلہ کریں جیسا کہ میں نے کیا ہے تو یقیناً وہ سب اسلام قبول کرلیں گے، بشرطیکہ وہ اغراض سے خالی ہو کر اسے دیکھیں۔

قرآن کو جب ایک شخص کھلے ذہن کے ساتھ پڑھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک ایسے مصنف کی کتاب ہے جو "ساتویں صدی" میں بھی "بیسویں صدی" کی باتوں کو جانتا تھا۔ قرآن کا یہ امتیاز واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدائے عالم الغیب کی کتاب ہے۔ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب نہیں۔ قرآن کی یہ استثنائی صفت قرآن کا زندہ معجزہ ہے۔ قرآن کی دعوت کو اگر آج کے انسان کے سامنے پیش کیا جائے تو قرآن کی یہ صفت اس کے حق میں بہت بڑی معجزاتی تائید ثابت ہوگی۔ لوگ مجبور ہوں گے کہ اس کو مانیں اور اس پر ایمان لائیں۔

تصویرِ ملّت

گاؤں کے چند لڑکے بے فکری کے ساتھ بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک لڑکے نے کہا کہ آؤ، جھوٹ موٹ کی کھچڑی پکائیں۔ دوسرا لڑکا بولا: جب جھوٹ موٹ ہی پکانا ہے تو کھچڑی کیوں پکائیں، پھر تو پلاؤ پکائیں۔

یہی حال موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین کا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹے پکوان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک قائد اٹھتا ہے اور پہلے سے زیادہ بڑا لفظ بول کر عوام کی ایک بھیڑ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ایک شخص اگر جھوٹی کھچڑی پکا رہا تھا تو دوسرا شخص جھوٹا پلاؤ اور جھوٹی بریانی پکانا شروع کر دیتا ہے۔

ایک قائد نے کہا: ہمارا مقصد ملک کے اندر اسلامی قانون نافذ کرنا ہے۔

دوسرا قائد بولا: ہم تو پورے کرۂ ارض پر اسلام کے کامل نظام عدل و قسط کو غالب و قائم کرنا چاہتے ہیں۔

تیسرے قائد نے کہا: ہمارے دین کی حقیقت احتسابِ کائنات ہے۔ ہم کو ستاروں سے بھی آگے جانا چاہیے۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ——— عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں۔

آدمی عمل سے جتنا زیادہ خالی ہو اتنا ہی زیادہ بڑے الفاظ وہ بولتا ہے۔ ان قائدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے قدموں کے نیچے بھی اسلام کو قائم کرنے میں ناکام ہیں، اس کے باوجود وہ تقریروں میں ساری انسانیت کو خطاب کر رہے ہیں اور سارے عالم میں نظام عدل قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ بولنے والے صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ مردہ لوگ ہیں، وہ زندہ لوگ نہیں۔ مردہ لوگ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں اور زندہ لوگ بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔

اس عموم میں صرف تبلیغی جماعت کا ایک استثنار ہے۔ وہ احتساب خویش کے لیے اٹھی ہے نہ کہ دوسروں کی طرح احتسابِ عالم کے لیے۔ اور یقیناً احتساب خویش ہی وہ کام ہے جو کرنے والوں کو کرنا چاہیے، اور جس کے لیے اٹھنے والوں کو اٹھنا چاہیے۔

غصہ اور کبر

قال یحییٰ علیہ السلام ان الغضب من الکبر۔ فقیل لہ کیف یکون الغضب من الکبر یا نبی اللہ ۔ قال الا ترون ان الذی یغضب انما یغضب علیٰ من دونہ من الناس مرتبۃ ولیس علیٰ من ھو اعلیٰ منہ

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ غصہ تکبر سے ہوتا ہے ۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول ، غصہ کا تعلق تکبر سے کیوں کر ہے ۔ فرمایا ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو شخص غصہ کرتا ہے وہ اس پر غصہ کرتا ہے جو درجہ میں اس سے کم ہو ۔ وہ اس پر غصہ نہیں کرتا جو اس سے برتر ہو ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غصہ ہمیشہ کبر کی نفسیات سے ظاہر ہوتا ہے ۔ اگر آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات پیدا ہو جائے تو وہ غصہ کرنا بھی چھوڑ دے ۔

متواضع آدمی کو بھی کبھی غصہ آتا ہے ۔ مگر اس کا غصہ وقتی ہوتا ہے ۔ اسی لیے وقتی ظہور کے بعد وہ ختم بھی ہو جاتا ہے ۔ متواضع آدمی وقتی غصہ کے بعد دوبارہ ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا ۔

لیکن کبر اور برتری کی نفسیات سے جو غصہ پیدا ہوتا ہے وہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے فریق کو ذلیل نہ کر لے ۔ جو شخص اپنے کو بڑا سمجھ لے وہ اس وقت آپے سے باہر ہو جاتا ہے جب اس کو محسوس ہو کہ کسی نے اس کی بڑائی کو چھو دیا ہے ۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے ۔ وہ بے قابو ہو کر اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے ۔ وہ اپنے قول اور عمل کی تمام طاقتیں اس کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ اس کو اس وقت تک تسکین نہیں ملتی جب تک وہ فریق مخالف کو چھوٹا کر کے اپنی بڑائی کے احساس کو دوبارہ بحال نہ کر لے ۔

مگر غصہ اور انتقام کی تمام کارروائی اپنے سے چھوٹے کے خلاف ہوتی ہے ۔ جس کو آدمی اپنے سے برتر پائے اس کے مقابلہ میں وہ جوش نہیں دکھاتا ، اس کے مقابلہ میں اس کے غصہ کی آگ سرد پڑی رہتی ہے ——— کبھی غصہ بھی کبر ہوتا ہے ، اور جو غصہ کبر ہو اس سے بڑا جرم اس دنیا میں اور کوئی نہیں ۔

اقدام سے پہلے

عن ابن عباس ان عبد الرحمٰن بن عوف و اصحابا له اتوا النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بمکة فقالوا یانبی اللّٰه ، کنا فی عزة ونحن مشرکون فلما آمنا صرنا اذلة قال: انی اُمرتُ بالعفو فلا تقاتلوا القوم

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۵۲۶)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی مکہ میں رسول اللہؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، جب ہم مشرک تھے تو ہم عزت کے ساتھ رہ رہے تھے۔ پھر جب ہم ایمان لائے تو ہم ذلیل ہوگیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو تم قوم سے جنگ نہ کرو۔

اسی واقعہ کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکو اور نماز قائم کرو اور زکواۃ ادا کرو (الم تر الی الذین قیل لهم کفوا ایدیکم واقیموا الصلوٰة واٰتوا الزکوٰة، النساء ۷۷)

قدیم مفسرین نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

فیه تنبیه علیٰ ان الجهاد مع النفس لاصلاح قلبه ونفسه مقدم علی الجهاد مع الکفار

(التفسیر المظہری، المجلد الثانی، صفحہ ۱۶۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکروں سے جہاد کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اپنے قلب اور نفس کی اصلاح کے لیے اپنے آپ سے جہاد کیا جائے۔

یہاں "ہاتھ کو روکو اور نماز قائم کرو" کے فقرہ میں جو حکم دیا گیا ہے اس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگا ——— "خارجی اقدام سے رکو اور داخلی تیاری کرو"۔ نماز کی اصل حقیقت اگرچہ اللہ کی یاد ہے (اقم الصلوٰة لذکری) مگر اس کا نظام اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کی پوری زندگی کی اصلاح کے لیے ایک مکمل کورس بن گیا ہے۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے نماز کو ضائع کیا وہ بقیہ چیزوں کو بھی یقینی طور پر ضائع کر دے گا (ومن ضیّعها فهو لما سواها اضیع)

اسلام میں جنگ صرف بطور دفاع ہے۔ اسلام میں اصل چیز دعوت ہے۔ یعنی لوگوں کو پُرامن طور پر اور حکیمانہ انداز میں حق کی طرف بلانا۔ یہی اسلامی عمل کا آغاز ہے اور یہی اس کا اختتام بھی۔ تاہم فریق ثانی اگر جبار حیت سے باز نہ آئے تو اس سے دفاعی جنگ کی جائے گی۔

مگر دفاعی جنگ کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اس سے پہلے مسلمان نماز کو قائم کرنے والے بن چکے ہوں۔ نماز کیا ہے۔ نماز ایک مکمل دینی تربیت ہے۔ نماز میں یہ ہوتا ہے کہ موذن پکارتا ہے "آؤ فلاح کی طرف" اور تمام مسلمان اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ اپنے کو پاک صاف کر کے نماز میں داخل ہوتے ہیں۔ نماز میں وہ بار بار اللہ اکبر کہہ کر اللہ کے بڑے ہونے اور اس کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ تمام مسلمان صف بستہ ہو کر صرف ایک امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں۔ کوئی ایک شخص بھی اِدھر اُدھر منتشر نہیں ہوتا۔ نماز ختم ہونے کے بعد تمام نمازی دائیں بائیں رُخ کر کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہیں۔ اس طرح وہ ظاہر کرتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کے لیے ان کے اندر خیر خواہی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ان کے لیے اللہ سے دعا کرنے والے بن گیے ہیں۔

یہی وہ نماز ہے جس کی اقامت کو جہاد سے پہلے لازم قرار دیا گیا ہے۔ مسلمان جب تک ان معنوں میں نماز کو قائم کرنے والے نہ بن چکے ہوں ان کے لیے جہاد و مقابلہ کے لیے نکلنا جائز نہیں۔ اس تربیتی کورس سے پوری طرح گزرنے سے پہلے صرف صبر کرنا ہے۔ فریق ثانی خواہ کتنا ہی ظلم کرے انھیں یک طرفہ طور پر صرف صبر اور برداشت کے رویہ پر قائم رہنا ہے۔ مسلمان اگر اس نماز پر اپنے آپ کو پوری طرح قائم کر لینے سے پہلے جہاد کی باتیں کریں تو وہ سراسر باطل ہوگا۔ اس کا خدا اور رسول کے طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔

خدا نے جہاد کا جو طریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے پورے اہتمام کے ساتھ نماز قائم کی جائے۔ ایسی حالت میں جو لوگ نماز کی اقامت کے بغیر جہاد کی اقامت کا نعرہ لگائیں وہ بلاشبہ غلطی پر ہیں۔ وہ لوگوں کو ایک ایسے دین کی طرف بلا رہے ہیں جس کو انھوں نے خود گھڑا ہے۔ اور جو دین خود گھڑا جائے وہ یقینی طور پر صرف آدمی کی بربادی میں اضافہ کرے گا، وہ کسی حال میں آدمی کی کامیابی اور ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

ایک تجربہ

۱۹۶۶ کی بات ہے۔ اس وقت میں ندوہ (لکھنؤ) میں تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ پولیس کی گاڑی ندوہ کے احاطہ میں آکر رکی۔ اس میں سے کئی پولیس کے لوگ برآمد ہوئے۔ ان کو ندوہ کے ذمہ داروں نے ٹیلی فون کرکے بلایا تھا تاکہ وہ ان کے ایک سنگین مسئلہ کو حل کریں۔

مسئلہ یہ تھا کہ ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی دونوں بالکل پاس پاس ہیں۔ یونیورسٹی کا ایک ہاسٹل ندوہ کی دیوار سے ملا ہوا ہے۔ اس ہاسٹل کے لڑکے جو سب کے سب غیر مسلم تھے ندوہ والوں کو مسلسل پریشان کر رہے تھے۔ وہ گالی دیتے، پتھر پھینکتے، مذاق اڑاتے اور طرح طرح کی نازیبا حرکتیں کرتے۔ ان کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ندوہ کے لوگ مشتعل ہوکر کوئی جارحانہ کارروائی کریں اور پھر یونیورسٹی کے لڑکوں کو ندوہ کے خلاف بھرپور فساد کرنے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔

یہ مسئلہ برسوں سے جاری تھا۔ ندوہ والوں نے پریشان ہوکر پولیس بلائی اور ان سے فریاد کی۔ پولیس والے حسب دستور رسمی کارروائی کرکے واپس چلے گئے۔ اور اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔

یہ مسئلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۷۴ میں ندوہ کے ذمہ داروں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ مسئلہ نہ پولیس کے ذریعہ حل ہوسکتا ہے اور نہ براہ راست ٹکراؤ کے ذریعہ اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو تالیف قلب کے اسلامی اصول کو استعمال کرکے حل کیا جائے۔ اس فیصلہ کے تحت مولانا علی میاں کے رفیق خاص مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم اس کے ذمہ دار بنائے گئے۔

منصوبہ کے مطابق مولانا اسحاق جلیس ندوی نے پہلے یہ پتہ لگایا کہ ہاسٹل کے لڑکوں میں لیڈر کون کون ہے۔ انھوں نے ان لیڈروں سے ملاقات کی۔ ان کو ندوہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ چائے پر بلایا گیا۔ ندوہ والوں نے ان "ظالم" لڑکوں سے ان کے ظلم اور بدتمیزی کے بارہ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ ان سے ساری ملاقات اور گفتگو اس طرح کی گئی جیسے کہ ندوہ والوں کو ان سے کوئی شکایت ہی نہیں۔ پوری مدت میں ندوہ کے لوگ ان سے اس طرح معتدل انداز میں ملتے رہے جیسے کہ ان کی طرف سے ظلم وزیادتی کا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔

ان گفتگوؤں اور ملاقاتوں کے نتیجہ میں، عین پیشگی منصوبہ کے مطابق، یہ ہوا کہ ندوہ کی ٹیم اور

یونیورسٹی کی ٹیم کے درمیان ہاکی میچ رکھا گیا۔ ندوہ کے لڑکے ہاکی کھیلنے میں مشہور ہیں۔ مگر انھیں پیشگی طور پر یہ سمجھا دیا گیا کہ تمہیں اس میچ میں جیتنا نہیں ہے۔ تم کو جان بوجھ کر خراب کھیل کھیلنا ہے تاکہ تم ہار جاؤ۔ منصوبہ یہ تھا کہ جان بوجھ کر یونیورسٹی کے لڑکوں کو کھیل میں جتایا جائے اور پھر انھیں ہیرو بنا کر ان کے دل کو جیتنے کی کوشش کی جائے۔

مقررہ تاریخ کو دونوں کے درمیان ہاکی میچ ہوا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ندوہ کے نوجوان خراب کھیل کھیلے اور یونیورسٹی کے لڑکوں کو بالقصد یہ موقع دیا کہ وہ بہتر کھیل کھیل کر میچ جیتیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ کے طلبہ کے مقابلہ میں "شاندار طور پر" کامیاب ہو گیے۔ اب طے شدہ منصوبہ کے مطابق یونیورسٹی کے لڑکوں کو خوب اچھالا گیا۔ مختلف طریقوں سے ان کی تالیف قلب کی گئی۔ ان کو دل کھول کر انعامات دیئے گیے۔ ان کا ہیروانہ استقبال کیا گیا۔ وغیرہ

یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی چاہتے تھے اور ندوہ والوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جھکا کر ان کی بڑائی کا اعتراف کر لیا۔ ندوہ کے لوگوں نے اپنے مذکورہ عمل سے یونیورسٹی کے طلبہ کے جذبات برتری کو پوری طرح تسکین دے دی۔ اب مسئلہ اپنے آپ حل تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے اس کے بعد پھر کبھی ندوہ والوں کو پریشان نہیں کیا۔

یہ ایک عظیم الشان مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا حل کیا ہے وہ حل یہ ہے کہ مسلمان یک طرفہ اقدام کے ذریعہ ہندو مسلم تناؤ کو ختم کر دیں۔ وہ خود "چھوٹے بھائی" بن کر فریق ثانی کو "بڑے بھائی" کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں اور اس کے بعد ان کے تمام مسئلے یقینی طور پر حل ہو جائیں گے۔

ندوہ کا مذکورہ واقعہ مزید اس جھوٹے اندیشہ کو غلط ثابت کرتا ہے کہ اگر ہم جھکیں گے تو وہ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ مذکورہ واقعہ میں ندوہ والوں نے واضح طور پر یک طرفہ جھکاؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے غیر مسلم طلبہ کی ہمتیں اور زیادہ بڑھ جائیں۔ وہ پہلے سے زیادہ جری ہو کر ندوہ والوں کو ستانے لگیں۔ ندوہ والوں کا نرم رویہ ان کو اور زیادہ سخت رویہ والا بنا دے۔ مگر ایسا قطعاً نہیں ہوا بلکہ ندوہ والوں کے جھکاؤ نے انھیں بھی جھکا دیا۔ ایک فریق کی نرمی دوسرے فریق کو نرم کرنے کا سبب بن گئی۔ جو مسئلہ دس سال سے ناقابلِ حل بنا ہوا تھا،

وہ ایک دن کے اندر لڑے بھڑے بغیر حل ہو گیا۔ ۱۹۷۴ کے بعد وہ دوبارہ کبھی پیش نہیں آیا۔

ندوہ کے اس چھوٹے سے واقعہ میں اس عظیم تر مسئلہ کے بارہ میں رہنمائی موجود ہے جس کو عام طور پر ملی مسئلہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ عملی تجربہ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ملک کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ندوہ والوں نے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اپنے محدود دائرہ میں جو تدبیر کی وہی تدبیر وسیع تر دائرہ میں ملت کے مسائل کا بھی واحد یقینی حل ہے۔ اگر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت دیں، جس کا ثبوت ندوہ والوں نے دیا تو یقینی طور پر ان کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ امن اور یکسوئی کے ماحول میں اپنی تعمیر و ترقی کا کام کر سکیں۔ اس کے بعد وہ تعمیر کے کام کے لیے بھی مواقع پا لیں گے اور اسلام کی اشاعت کے کام کے لیے بھی۔

مسئلہ کے حل کا جو تجربہ دس سال پہلے ندوہ میں کامیاب طور پر کیا گیا تھا، وہ ندوہ کے باہر ملت کے وسیع تر دائرہ میں کیوں اب تک اختیار نہ کیا جا سکا۔ اس کا سبب متناقض طور پر Paradoxically خود ندوہ کے ذمہ دار اور ان کے جیسے دوسرے قائدین ہیں۔ اس المیہ کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ان قائدین ملت نے اس حدیث رسول پر عمل نہیں کیا جس میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم دوسروں کے لیے بھی وہی چیز پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو (احبّ للنّاس ما تُحبّ لنفسك) ؎

ان قائدین نے جس تدبیر سے اپنا ذاتی مسئلہ کامیاب طور پر حل کیا، ان پر لازم تھا کہ دوسروں کو بھی وہ وہی تدبیر بتائیں۔ وہ ساری مسلم قوم کو اسی آزمودہ طریق کار کا سبق دیں۔ مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کیا بلکہ وہ ملت کو اس کے برعکس تدبیر اختیار کرنے پر ابھارتے رہے۔ اپنا مسئلہ انھوں نے خاموش تدبیر سے حل کیا تھا اور قوم کو وہ پرشور تدبیر اختیار کرنے کا سبق دیتے رہے۔ اپنا مسئلہ انھوں نے مفاہمت کے ذریعہ حل کیا تھا اور ملت کو انھوں نے مقابلہ آرائی کا پیغام دیا۔ اپنے لیے انھوں نے شکست کو مان کر جیتنے کا راز دریافت کیا تھا اور دوسروں کو وہ اپنی تقریروں میں للکارتے رہے کہ

؎ یہ ایک مشہور حدیث ہے جو مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:
لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ، رواہ البخاری و مسلم

ہرگز شکست نہ ماننا، چاہے تم سب کے سب ہلاک ہو جاؤ۔ اپنے ذاتی حریف کو پیش کرنے کے لیے ان کے پاس تالیف قلب کا گلدستہ تھا۔ مگر جب وہ قوم کے سامنے آئے تو اس کو یہ کہہ کر ابھارا کہ تم سیف اللہ اور صمصام الاسلام بن کر اپنے حریف کا مقابلہ کرو۔ تقریر و خطابت کے لیے ان کے پاس دوسرا اسلام تھا اور عمل کے لیے بالکل دوسرا اسلام۔

قائدین کا یہی تضاد ملت کے تمام مسائل کا واحد سبب ہے۔ ہمارے قائدین اپنے ذاتی مسائل کو مفاہمت اور خوش تدبیری کے ذریعہ حل کر رہے ہیں: اور ملت کے نوجوانوں کو اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ لامتناہی طور پر اپنے حریفوں سے لڑتے رہیں۔ اسی تضاد کا یہ کرشمہ ہے کہ ہمارے قائدین خود تو ہر قسم کے جانی اور مالی نقصان سے بچے ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کو کبھی کوئی زخم نہیں لگا۔ اور ملت کا حال یہ ہے کہ وہ بے فائدہ طور پر اپنا جان بھی برباد کر رہی ہے اور اپنا مال بھی۔ اگر اسلام کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ مجنونانہ اقدام کر کے اپنے مکانوں اور دکانوں کو نذر آتش کرایا جائے تو محترم قائدین کے مکان اور دکان کیوں نذر آتش نہیں ہوتے۔ اگر اسلام کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی مشتعل ہو کر لڑے اور شہید ہو جائے تو خود قائدین اپنے آپ کو اس فضل شہادت سے کیوں محروم کیے ہوئے ہیں۔

ندوہ سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا ہے جس کا نام ہے 'تعمیر حیات'۔ اس کی اشاعت ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ میں ندوہ کے ذمہ دار اعلیٰ کا ایک خصوصی انٹرویو چھپا ہے۔ اس کا جلی عنوان یہ ہے:

مسلمانوں کو اس ملک میں اپنا وزن ثابت کرنا ہوگا۔

اس انٹرویو میں ندوہ کے مذکورہ ذمہ دار نے فرمایا کہ "کسی قوم یا فرقہ کا وزن اس وقت محسوس کیا جاتا ہے جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ نفع کے علاوہ نقصان بھی پہونچا سکتا ہے۔"

ندوہ کے مذکورہ ذمہ دار پچھلے بیس سال سے ہندستان کے "مظلوم" مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنے مسئلہ کے حل کے لیے نقصان رسانی کی اہلیت کا ثبوت دو۔ یہی مشورہ انھوں نے ۱۹۶۶ کے ہندستانی الکشن میں مسلمانوں کو دیا تھا۔ مذکورہ انٹرویو کے مطابق اب بھی وہ قوم کو یہی مشورہ دے رہیں۔ "مفکر اسلام" کا یہ قیمتی مشورہ نعوذ باللہ خود پیغمبر اسلام کو بھی معلوم نہ تھا۔ ورنہ وہ مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو حبش یا یثرب کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ نہ دیتے بلکہ یہ کہتے کہ قریش مکہ کو نقصان پہونچا کر تم اپنے لیے مکہ میں زندگی کا حق وصول کرو۔

عجیب بات یہ ہے کہ مذکورہ بزرگ نے خود اپنے ادارہ کے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ ادارہ کے لوگ اپنے حریف کے مقابلہ میں بالکل بے ضرر بن جائیں۔ وہ یک طرفہ طور پر جھک کر فریقِ ثانی کی برتری تسلیم کرلیں مگر ملت کو وہ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم میدانِ مقابلہ میں ڈٹ جاؤ۔ تم اپنے حریف کو ضرر پہونچاؤ تم فریقِ ثانی کو جھکنے پر مجبور کردو۔ یہ تضاد بھی کیسا عجیب ہے کہ ایک انسان اپنے ذاتی معاملہ میں یک طرفہ طور پر فریقِ ثانی کے آگے جھک کر اپنے مسئلہ کو حل کرتا ہے اور ملت کو وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ تم اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود فریقِ ثانی کو جھکاؤ اور اس کو نقصان پہونچا کر اپنے مسئلہ کو حل کرو۔

مسئلہ کے حقیقی حل کے لیے اکثر آدمی کو اپنی بڑائی کے بت کو توڑنا پڑتا ہے۔ مذکورہ مثال میں ندوہ والوں نے یونیورسٹی والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کو توڑا، اسی وقت یہ ممکن ہوا کہ مسئلہ کے حل کی راہیں کھلیں۔ ذاتی معاملہ میں چوں کہ آدمی سنجیدہ ہوتا ہے، وہ فوراً اپنی ذاتی بڑائی کے بت کو توڑنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ وہ مسئلہ کے حل کو اصل قرار دیتا ہے نہ کہ اپنی ذات کی بڑائی کو۔ مگر ملت کے معاملہ میں لوگ اتنا سنجیدہ نہیں جتنا وہ ذاتی مفاد کے معاملہ میں سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں وہ اپنی بڑائی کے بت کو نہیں توڑتے۔ ذاتی مفاد کے معاملہ میں ہر شخص اپنی بڑائی کو توڑے ہوئے ہے مگر ملت کے مفاد کے معاملہ میں کوئی شخص اپنی بڑائی کو توڑنے پر راضی نہیں۔

مذکورہ انٹرویو میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "اخلاقی قیادت کرکے مسلمان ہندستان کی ناگزیر ضرورت بن سکتے ہیں" یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ سراسر ناکافی ہے۔ ندوہ کے مذکورہ بزرگ کو اپنے اس مشورہ کے ساتھ اپنا ۱۹۷۴ کا تجربہ بھی بتانا چاہیے۔ انھیں اسی کے ساتھ اس کا بھی اعلان کرنا چاہیے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے غیر مسلم طلبہ کے مقابلہ میں انھوں نے کس تدبیر کے ذریعہ اخلاقی فتح حاصل کی تھی۔

وہ تدبیر ایک لفظ میں یک طرفہ جھکاؤ تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے طلبہ کے مقابلہ میں یک طرفہ طور پر ہار قبول کی۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو چھوٹا بنایا۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو نرم رویہ کا پابند کیا۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ اپنے آپ کو مقابلہ آرائی کے مقام سے ہٹائیں۔ ندوہ والوں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو اخلاقی قیادت کا درس دینے کے ساتھ یہ بھی ضرور بتائیں کہ اس کار از یک طرفہ جھکاؤ ہے اور اس کا کامیاب تجربہ وہ خود ۱۹۷۴ میں کرچکے ہیں۔

مستقبل پکار رہا ہے

درخت کیا ہے۔ درخت خدا کا ایک جادو ہے۔ وہ ایک معجزانی واقعہ ہے جو خدا اپنی خصوصی قدرت سے زمین پر ظاہر کرتا ہے۔ درخت اس بات کا اعلان ہے کہ کوئی ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اس کے لئے زندگی اور ہریالی کا ایک نیا امکان کھول دے، کوئی ہے جو خدا کے ساتھ ایک امید قائم کرے تاکہ خدا اس کی امید کو اس کے قیاس و گمان سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں اس کے حق میں پورا کر دے۔

جب برسات کا موسم آتا ہے اور پانی سے لدے ہوئے بادل آسمان میں تیرنا شروع کرتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک فضاؤں میں ایک تبدیلی کا اعلان کرتی ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بارش کا پیغام لے کر ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں تو یہ سب دراصل خدا کے ایک مطلوب کا اظہار ہوتا ہے، یہ مطلوب کہ خدا اپنی زمین میں کچھ ہرے بھرے درخت اگانا چاہتا ہے۔ اس وقت جو کسان خدا کے اعلان کو سمجھ لے اور ایک بیج لے کر زمین میں ڈال دے تو اس کے فوراً بعد خدا کا جادو ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں خالی زمین تھی وہاں معجزانی طور پر ایک سرسبز و شاداب کائنات نکل کر کھڑی ہو جاتی ہے جس کے سائے کے نیچے لوگ پناہ لیں۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جو لوگوں کے لئے رنگت اور خوشبو اور لذت کا ایک عظیم خدائی دسترخوان بن جائے۔

دنیا کا معاملہ بھی آج کچھ ایسا ہی ہے۔ موجودہ دنیا کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حد پر پہونچ کر کسی نئے انقلاب کا انتظار کر رہی ہے ـــــ خدا کا نام آج لوگوں کے لیے ذاتی کاروبار کا

عنوان بن چکا ہے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کو صرف فساد اور بگاڑ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں لوگوں کے لئے لوٹ کا میدان بنی ہوئی ہیں۔ خدا کی دنیا میں انسان نے خود اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر بٹھا رکھا ہے۔ ظلم اور فساد اتنا بڑھ چکا ہے کہ انسانی نسل پر دوبارہ وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو حضرت نوح نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے بارہ میں کہے تھے: انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا الا فاجرا كفارا (نوح ۲۷)

بگاڑ کی یہ انتہا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہو۔ وہ وقت آگیا ہے کہ دوبارہ زمین پر ایک طوفان نوح برپا ہو، تاکہ تمام برے لوگ اس میں غرق کر دئے جائیں اور تمام اچھے لوگ اس سے بچا کر خدا کی زمین کے وارث بنا دیے جائیں اور پھر وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کریں جو موجودہ دنیا سے زیادہ بہتر ہوگی اور زیادہ بابرکت۔

مگر طوفان نوح سے پہلے اعلان نوح کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے کچھ بندے اٹھیں اور اپنی صحیح ترین اور کامل ترین صورت میں حق کا اعلان کر دیں۔ خدائی موسم اب آخری طور پر آچکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ کوئی کسان اپنا بیج لے کر زمین میں ڈال دے۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن خدا کا معجزانی کرشمہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ خدا کی نصرتیں اس بندہ کے اوپر آسمان کے دروازے پھاڑ کر ٹوٹ پڑیں گی تاکہ جو کچھ بندے کو کرنا ہے بندہ اسے انجام دیدے۔ اور تاکہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے خدا اس کو ظہور میں لے آئے۔

اعلان حق کا مطلب حق کو آخری حد تک مبرہن کر دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کل خدائی کی سطح پر کھولا جانے والا ہے اس کو آج بندگی کی سطح پر لوگوں کے لئے کھول دیا جائے۔ اس کے بعد وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اور وہ لوگ دوسری طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو نہیں پہچانا اور اپنے آپ کو اس کی سمت میں کھڑا نہیں کیا۔ جب یہ عمل پورا ہو جاتا ہے تو اس کے فوراً بعد خدا کا آخری فیصلہ آجاتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ پہلا گروہ جنت کے زینہ پر کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گروہ جہنم کے زینہ پر۔

اردو صحافت اور اخلاقیات

اردو صحافت اور اخلاقیات ـــــ باعتبار واقعہ ایک متضاد ترکیب ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ غضبناک آدمی اور خوش اخلاقی، نیم کی پتی اور شیرینی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقیات ایک مثبت رویہ کا نام ہے، اور اردو صحافت بطور واقعہ کبھی مثبت چیز تھی ہی نہیں۔ اردو صحافت تمام تر ردعمل کے طور پر ظہور میں آئی۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ ردعمل ہی کے رویہ کا دوسرا نام منفی رویہ ہے۔

لکھنؤ کے ایک مسلم اخبار (قائد) نے ایک بار اردو صحافت کی پالیسی کو احتجاجی پالیسی کا عنوان دیا تھا۔ اخبار مذکور نے یہ بات بطور فخر کہی تھی، مگر میں اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ صحیح ترین لفظ ہے جو اردو صحافت کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ اردو صحافت بنیادی طور پر ایک احتجاجی صحافت ہے۔ اور احتجاجی صحافت بلاشبہ اخلاقیات کی نفی ہے۔ اردو صحافت مسلم مسائل کو پیش کرنے کے لیے وجود میں آئی نہ کہ حقیقت واقعہ کو بیان کرنے کے لیے۔ گویا کہ موجودہ اردو اخبارات مسلمانوں کے صحافی وکیل ہیں۔ وہ حقیقت کو غیر جانبدارانہ طور پر بیان کرنے والے نقیب نہیں۔

"اخلاقیات" ایک مثبت اصطلاح ہے۔ اگر میں اخباری اخلاقیات کا تعین کروں تو اس کے اجزار سادہ طور پر غالباً حسب ذیل ہوں گے:

۱۔ مثبت نقطۂ نظر کا حامل ہونا، ایسا نقطۂ نظر جو کسی قسم کے مخالفانہ حالات سے بطور ردعمل نہ بنا ہو، بلکہ خود اپنی ایجابی غور و فکر سے وجود میں آیا ہو۔

۲۔ حالات کی مطابق واقعہ رپورٹنگ۔

۳۔ قومی اور بین اقوامی مسائل کا منصفانہ تجزیہ۔

اب میں ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے اردو صحافت پر مختصراً اظہار خیال کروں گا۔

مثبت نقطۂ نظر کا فقدان

اردو صحافت کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ اس کے بانیوں اور معماروں نے انسانی حقیقتوں پر غور کیا۔ انھیں اس قسم کی کوئی ابدی حقیقت دریافت ہوئی جیسی حقیقت ایک سائنس داں دریافت کرتا ہے اور پھر یہ لوگ اس دریافت سے بے چین ہو کر اس کے اظہار کے لیے صحافت

کے میدان میں داخل ہوگیے ۔ اس کے برعکس اردو صحافت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے تقریباً تمام صحافی جس "اسکول آف جرنلزم" میں بنے وہ ان کے وقتی حالات تھے ۔ وہ اپنے وقتی اور قریبی حالات سے متاثر ہوئے اور اس کے بعد وہ اپنی جوابی نفسیات کے اظہار کے لیے صحافت کے میدان میں کود پڑے۔ ان میں سے کسی نے اپنے اخبار کا نام سیدھے طور پر "ندائے ملت" رکھ دیا اور کسی نے بظاہر دوسرا نام رکھا۔ مگر ہمارا ہر اخبار حقیقتہً ندائے ملت ہوتا ہے نہ کہ ندائے حقیقت ۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ اردو صحافت ، وہ اردو صحافت جس کی نمائندگی اس ملک میں مسلمانوں نے کی ہے ، وہ اپنے آغاز ہی سے ردعمل کی پیداوار رہی ہے۔ مسلمانوں کے تمام اردو اخبارات کسی نہ کسی "دشمن اسلام" کے خلاف ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئے ۔ دہلی کے ایک اخبار نے اپنے صفحۂ اوّل کی ایک جلی سُرخی ان الفاظ میں قائم کی تھی :

"آگ اور خون میں نہائے ہوئے مسلمان سوال کرتے ہیں"

یہ سرخی بتاتی ہے کہ اردو اخبارات کس قسم کے ذہن کے تحت چلائے جارہے ہیں ۔ وہ ذہن یہی ہے کہ وہ "خون آلود" مسلمانوں کے نمائندہ بن کر ان کی طرف سے ان کے "مفروضہ" دشمنوں کے خلاف مضامین اور خبریں چھاپتے رہیں ۔ اردو صحافت ایک قسم کی وکیلانہ صحافت ہے نہ کہ کوئی اخلاقی صحافت ۔

وکیلانہ رویہ اور اخلاقی رویہ میں یہ فرق ہے کہ وکیل صرف اپنے مؤکل کو دیکھتا ہے اور اخلاقی رویہ کی نگاہ ہمیشہ وسیع تر حقیقتوں کی طرف ہوتی ہے ۔ وکیل محدود مفاد کا نمائندہ ہوتا ہے اور اخلاق آفاقی صداقت کا نمائندہ ۔

یہ بات اردو صحافت میں اتنی زیادہ عام ہے کہ وہی اخبارات سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ وکیلانہ رویہ کا مظاہرہ کریں ۔ لکھنؤ کا ایک اخبار جس کی اشاعت ۱۹۶۵ میں بمشکل ایک ہزار تھی وہ ۶۸ - ۱۹۶۷ میں مخالف کانگرس تحریک (Non-Congressism) میں شریک ہوگیا ۔ اس نے دھواں دھار طور پر مسلمانوں کی موافقت اور "فرقہ پرست حکومت" کی مخالفت شروع کردی ۔ وہ نام نہاد "معاہداتی سیاست" کا نقیب بن گیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اشاعت اچانک ایک ہزار سے بڑھ کر سولہ ہزار تک پہونچ گئی ۔ بعد کو جب معاہداتی سیاست ناکام ہوگئی تو اس اخبار کی اشاعت دوبارہ ایک ہزار سے بھی کم تھی ۔

اردو صحافت اپنے اس مزاج کی وجہ سے محض ایک قوم کی صحافت بن کر رہ گئی ہے۔ قومی صحافت کا اصول یہ ہوتا ہے: "میری قوم، صحیح یا غلط" اس کے برعکس اخلاقی صحافت کا اصول یہ ہوتا ہے: "عالمی صداقت، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف" اخلاقی اعتبار سے یہ کسی صحافت کی بنیادی خامی ہے اور اردو صحافت بلاشبہ اس خامی کی بدترین مثال ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد انگریزی حکومت کے خلاف ردعمل کی پیداوار تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کا اخبار اہل حدیث قادیانیوں، آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں کے خلاف ایک صحافتی محاذ قائم کرنے کا دوسرا نام تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا صدق مغربی تہذیب کے خلاف نوک جھونک کا صحافتی میدان تھا۔ دہلی کے مشہور اردو صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف تیز و تند مضامین لکھتے تھے جس کی نمائندگی مشہور فرقہ پرست اخبار پرتاپ کرتا رہا ہے۔ وغیرہ

مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمین دار میں ایک بار پُرفخر طور پر یہ شعر چھاپا تھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

یہی موجودہ زمانہ میں تمام اردو صحافیوں کا حال رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک فرضی "پانی پت" تھا۔ ہر ایک اپنے مفروضہ پانی پت کے میدان میں اپنے خیالی دشمن کو قلمی شکست دے کر فتح کی خوشی مناتا رہا۔

ہندستان کی اردو صحافت کی پوری تاریخ میں، میری معلومات کے مطابق، اس اعتبار سے صرف ایک قابل ذکر استثناء ہے اور وہ سرسید کے تہذیب الاخلاق کا ہے۔ تہذیب الاخلاق کو اگرچہ میں مکمل معنوں میں نہیں، تاہم ۵۰ فی صد مثبت صحافت سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ تہذیب الاخلاق کی بنیاد، دوسرے اردو جرائد کی طرح اغیار کے خلاف احتجاج پر نہ تھی۔ بلکہ اپنی قوم کی اصلاح و تعمیر کے مثبت جذبہ پر تھی۔

اردو صحافت میں غالباً سرسید پہلے قابل ذکر شخص ہیں جنھوں نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی اپنی غفلت کا مسئلہ ہے نہ کہ دوسروں کے ظلم اور تعصب کا مسئلہ۔ میرے اپنے الفاظ میں سرسید

کے فکر کا خلاصہ یہ تھا کہ ـــــ مسلمان موجودہ زمانہ کے علوم میں پیچھے ہوگیے ہیں، اس لیے وہ زمانی شعور میں بھی پیچھے ہیں۔ جب تک وہ زمانی شعور کے اعتبار سے زمانہ کی سطح پر نہ آجائیں وہ آج کی دنیا میں اپنے لیے باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

میرے نزدیک یہی وہ چیز ہے جہاں سے اخلاقیات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص یا گروہ خود اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے : ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم ۔ مولانا حالی نے اس آیت کے مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے :

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کو بدلنے کا

یہ دنیا کے بارہ میں خدا کا قانون ہے۔ ایسی حالت میں صحیح اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ اپنے مسائل کی ذمہ داری خود قبول کی جائے۔ جو چیز اپنی غفلت سے پیدا ہوئی ہے اس کی ذمہ داری خود قبول کرنے کا نام اخلاق ہے اور اپنی غفلت سے پیدا شدہ نتائج کو دوسروں کے اوپر ڈالنا، یہی وہ چیز ہے جس کو غیر اخلاقی فعل کہتے ہیں۔

بدقسمتی سے اکثر اردو صحافیوں کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ عام صحافیوں نے مسلمانوں کو یا تو اغیار کے ظلم کی مبالغہ آمیز داستانیں سنائیں جس کا نتیجہ صرف نفرت تھا۔ یا انھوں نے ماضی کی عظمت کے قصیدے پڑھے جس کا واحد ممکن انجام صرف یہ تھا کہ مسلمان جھوٹے فخر میں مبتلا ہو جائیں۔ جو چیز اپنی نہیں ہے اس کو "اپنے اسلاف" کی لفظی منطق سے اپنی بنا کر فرضی طور پر خوش ہوتے رہیں۔

مطابق واقعہ رپورٹنگ

صحافتی اخلاقیات کی ایک اہم خصوصیت مطابق واقعہ رپورٹنگ ہے۔ یعنی حالات و واقعات کو ٹھیک ویسا ہی بیان کرنا جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اس معاملہ میں اردو صحافت سب سے زیادہ ناقابل اعتبار صحافت ہے۔ اردو اخبارات کی رپورٹنگ نہ صرف یک طرفہ ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے وکیلانہ مزاج کی وجہ سے وہ اکثر غلط بھی ہوتی ہے۔

اردو صحافت کا بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے ظلم کے خلاف رد عمل کے طور پر ظہور میں آئی۔ چنانچہ پوری اردو صحافت مستقل طور پر ایک قسم کے احساس مظلومی

(Persecution complex) میں مبتلا رہتی ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو لوگ احساسِ مظلومی میں مبتلا ہوں وہ کبھی واقعات کو ہو بہو (As it is) پیش نہیں کر سکتے۔ وہ عین اپنی نفسیات کے تحت ہمیشہ واقعات کو اس طرح پیش کریں گے جس میں دوسرے لوگ ظالم کے روپ میں نظر آئیں اور خود ان کا اپنا وجود ان کی بنائی ہوئی تصویر میں مظلوم دکھائی دیتا ہو۔

احساس مظلومی میں مبتلا شخص کبھی واقعات کی غیر جانب دارانہ تحقیق نہیں کرتا۔ وہ واقعات کو جج کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ فریق کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ دو طرفہ نقطۂ نظر سے حالات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ یک طرفہ طور پر پیدا ہونے والے جذبات کے تحت رائے قائم کر کے فوراً اس کے مطابق لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اخبارات کی رپورٹیں یا تو یک طرفہ طور پر مسلم جذبات کو سامنے رکھ کر مرتب کی جاتی ہیں یا پھر ان میں بعض جزئی یا استثنائی واقعات کی تعمیم (Generalisation) ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں دیانت دارانہ رپورٹنگ کے خلاف ہیں۔

ایک مثال

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مارکسی پروفیسر عرفان حبیب پر یونیورسٹی کے کچھ مسلمان لڑکوں نے حملہ کیا۔ اس کے بعد دہلی کے ایک انگریزی اخبار کا رپورٹر علی گڑھ پہونچا۔ اس نے مذکورہ مارکسی پروفیسر کا انٹرویو لیا جو انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۳ جنوری ۱۹۸۱) میں چھپا۔ اس انٹرویو کے چھپنے کے بعد یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ اور زیادہ مشتعل ہو گیے۔ انھوں نے یونیورسٹی کیمپس میں توڑ پھوڑ اور اودھم بازی شروع کر دی، یہاں تک کہ یونیورسٹی بند ہونے کی نوبت آگئی۔

انھیں دنوں دلی کے ایک اردو ہفتہ وار کے ایڈیٹر ہمارے دفتر میں آئے۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ آج شام کو ہمارے اخبار کی کاپی پریس جا رہی ہے اور مجھے فوری طور پر علیگڑھ کے بارہ میں ایک اداریہ لکھنا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے پروفیسر حبیب کا وہ انٹرویو پڑھا ہے جس کی بنیاد پر یہ ہنگامے ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ جب آپ نے اصل انٹرویو کو نہیں پڑھا تو آپ اس کے بارہ میں اداریہ کیسے لکھیں گے۔" ہم چپ رہیں گے تو ہم مسلم عوام سے کٹ جائیں گے" انھوں نے کہا اور باہر چلے گیے۔ ان کا اخبار میرے پاس آیا تو اس میں علی گڑھ کے بارے میں ایک پرشور اداریہ موجود تھا۔

اس کے بعد مجھے خود اس موضوع پر لکھنے کی فکر ہوئی۔ میں نے چاہا کہ سب سے پہلے میں پروفیسر

عرفان حبیب کا مطبوعہ انٹرویو پڑھوں۔ اس سلسلہ میں میں نے متعدد اردو اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے معلوم کیا اور انھیں ٹیلی فون کیے۔ مگر نہ تو کسی کے پاس انڈین اکسپریس کا مطبوعہ پرچہ موجود تھا اور نہ ایسے لوگ ملے جو یہ کہیں کہ انھوں نے مذکورہ انٹرویو پورا کا پورا پڑھا ہے۔ حالاں کہ یہ تمام اخبارات وہ تھے جو پروفیسر عرفان حبیب کے خلاف اور علیگڑھ کے مسلم طلبہ کی حمایت میں پرشور مضامین اور خطوط شائع کر رہے تھے۔ اس موضوع پر اس زمانہ میں تقریباً ہر اردو اخبار نے لکھا تھا۔ مگر کسی ایک اخبار نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ پروفیسر عرفان حبیب کے متنازعہ انٹرویو کا مکمل ترجمہ چھاپے تاکہ اردو قارئین اصل انٹرویو کو پڑھ کر کوئی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہو سکیں۔ ہر ایک صرف اپنا تبصرہ چھاپ رہا تھا، متنازعہ انٹرویو کسی نے بھی نہیں چھاپا۔

آخر کار میں اس کی تلاش میں انڈین اکسپریس کے دفتر گیا۔ وہاں اخبار کی فائل نکلوا کر پروفیسر عرفان حبیب کا مذکورہ انٹرویو پڑھا۔ اس کی فوٹو کاپی لی۔ اور پھر اس کے بارے میں دو صفحہ کا ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ الرسالہ (اگست ۱۹۸۱) میں چھپ چکا ہے۔ میرے اس مضمون کا عنوان تھا ——— "آہ یہ بے شعوری"۔

پروفیسر عرفان حبیب کے اس مطبوعہ انٹرویو کو آپ پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جس پر مشتعل ہونے کی ضرورت ہو۔ اس انٹرویو کا خلاصہ یہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو تعلیم سے زیادہ ہنگامہ بازی میں دل چسپی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عین وہی واقعہ تھا جس کی تصدیق خود ان طلبہ نے انٹرویو کے بعد یونیورسٹی میں اپنے پرتشدد ہنگاموں سے عملی طور پر فراہم کر دی۔

ایک مسلمان ایڈیٹر صاحب جنھوں نے اصل انٹرویو کا خلاصہ پڑھا تھا، ان سے میں نے کہا کہ آپ انٹرویو کے خلاف مسلسل مضامین چھاپ رہے ہیں، پھر آپ اصل انٹرویو کو کیوں نہیں چھاپتے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم انٹرویو کو بجنسہٖ چھاپ دیں تو طلبہ کی مہم کمزور پڑ جائے گی۔ کیوں کہ اصل انٹرویو میں کوئی بہت زیادہ قابل اعتراض بات نہیں۔ گویا معاملہ حق اور ناحق کا نہیں۔ بلکہ اپنی قوم کی یک طرفہ حمایت کرنے کا ہے۔ اور اپنی قوم کی یہ یک طرفہ حمایت وہ لوگ کر رہے ہیں جو مغربی قومیت کے اس تصور کا مذاق اڑاتے ہیں کہ میری قوم، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر:

My country, right or wrong.

کیا اخلاق اسی کا نام ہے۔ اگر یہ اخلاق ہو تو دوسری کون سی چیز دنیا میں ہے جس کو اخلاق کے خلاف کہا جائے۔

جھوٹی شکایت

اردو اخبارات کی رپورٹیں اور مضامین خواہ وہ جس موضوع پر بھی ہوں، ان کا مشترک خلاصہ صرف ایک ہوتا ہے۔ اور وہ ہے جھوٹی شکایت۔ دوسروں کے بارہ میں جھوٹی شکایت ہمارے اخبارات کا سب سے زیادہ محبوب موضوع ہے۔

ان شکایتوں کو میں جھوٹی شکایت کیوں کہتا ہوں، اس کی ایک مثال لیجئے۔ ہمارے تمام اردو اخبارات مشترک طور پر اس بات کے شاکی ہیں کہ ملک کا قومی پریس (بڑے بڑے انگریزی اخبارات) مسلم معاملات کی صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے۔ ہر اردو اخبار بلاتکان اس شکایت کو کسی نہ کسی شکل میں دہراتا رہتا ہے۔

مگر یہ شکایت سراسر بے معنی ہے۔ پہلی بات یہ کہ قومی پریس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پوری ہندستانی قوم کی مشترک ملکیت ہے۔ وہ قومی پریس صرف اس معنی میں ہے کہ وہ پورے ملک میں پڑھا جاتا ہے۔ وہ اردو اخبارات کی طرح صرف، ایک فرقہ کا اخبار (کمیونٹی پیپر) نہیں۔ پھر ان اخبارات میں جب دوسروں کا پیسہ لگا ہوا ہے، جب دوسروں کے ذہن ان کو چلا رہے ہیں۔ اور دوسرے ہی لوگ ان کے اصل خریدار ہیں تو ایسے اخبارات آخر مسلم جذبات کی نمایندگی کیوں کریں گے۔ اسباب کی اس دنیا میں یہ سراسر غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی کہ جن اخبارات کو تمام تر دوسرے لوگ چلا رہے ہوں ان سے ہم یہ امید رکھیں کہ وہ ہمارے اپنے جذبات کی ترجمانی کریں گے۔

اس مطالبہ کے پیچھے دوسرا زور اخلاقی زور ہو سکتا تھا۔ یعنی ہم اپنے اردو اخبارات میں دوسروں کی باتوں کی صحیح ترجمانی کر رہے ہوں۔ اگر ہم فی الواقع ایسا کریں تو کم از کم اخلاقی طور پر ہمیں یہ امید رکھنے کا حق ہے کہ دوسرے بھی اپنے اخبارات میں ہماری باتوں کی صحیح ترجمانی کریں گے۔

مگر بدقسمتی سے ہمارے مطالبہ کے پیچھے یہ اخلاقی زور بھی موجود نہیں۔ کیوں کہ اس معاملہ میں اردو اخبارات کا حال انگریزی اخبارات سے بھی زیادہ برا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو اخبارات

میں دوسروں کی باتیں نہایت بگڑی ہوئی شکل میں پیش کی جاتی ہیں۔ پھر دوسرے بھی اگر اپنے اخبارات میں ایسا ہی کریں تو ہمیں ان سے شکایت کرنے کا کیا حق۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے یہاں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے ۲۱ اپریل ۱۹۸۴ کو بمبئی میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر اردو اخبارات میں اشتعال انگیز سرخیوں کے ساتھ چھپی۔ اس کے بعد اس علاقہ کے مسلمان بھڑک اٹھے یہاں تک کہ مئی ۱۹۸۴ میں بھیونڈی اور بمبئی کے فسادات ہوئے جس میں مسلمانوں کا زبردست نقصان ہوا۔

مسٹر بال ٹھاکرے کی اس تقریر کے بارے میں ہر اردو اخبار یہ لکھ رہا تھا کہ اس میں پیغمبر اسلام کی توہین کی گئی ہے۔ ایک اردو اخبار نے اس تقریر کے اوپر حسب ذیل سُرخی لگائی:

مسلمانوں کے پیغمبر ہمارا بول و براز صاف کرتے تھے: ٹھاکرے کی دریدہ دہنی

مگر یہ ساری باتیں خود ساختہ رپورٹ کی بنیاد پر ہو رہی تھیں۔ میں نے بہت سے صحافیوں سے پوچھا کہ کیا آپ نے بال ٹھاکرے کی تقریر کا متن پڑھا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے اس تقریر کا ٹیپ سنا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے پوچھا، کیا آپ نے بال ٹھاکرے کا وہ انٹرویو دیکھا ہے جو انگریزی ہفتہ وار (Link) ۳ جون ۱۹۸۴ میں چھپا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ کیسا اسلام ہے کہ آپ بلا تحقیق اس کے خلاف اخباری محاذ قائم کیے ہوئے ہیں۔

میری عادت ہے کہ میں براہِ راست تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کہتا۔ چنانچہ میں نے ہفتہ وار لنک کا مذکورہ شمارہ حاصل کیا۔ اس کو مکمل پڑھا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ الرسالہ (ستمبر ۱۹۸۴) میں چھپ چکا ہے۔

مذکورہ شائع شدہ انٹرویو کے مطابق بال ٹھاکرے نے کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہی۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے صحیح بخاری کی ایک روایت اپنے الفاظ میں نقل کی۔ اس روایت میں حضرت ابوہریرہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مدینہ کی مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے۔ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی بہا دو۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گیے ہو، تم مشکل پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجے گیے۔

مسٹر بال ٹھاکرے نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا کہ دیکھو مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کا یہ حال تھا، مگر اب مسلمانوں میں اس قسم کی برداشت کہاں ہے :

But where is that kind of tolerance in this community now.

مسٹر بال ٹھاکرے کا یہ مطبوعہ انٹرویو کسی بھی اردو اخبار میں نقل نہیں کیا گیا۔ البتہ اس کے بعد ہر اردو اخبار نے بلا استثناء مسٹر بال ٹھاکرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اردو اخبارات نے مسٹر بال ٹھاکرے کی بات کو نہایت بگڑی ہوئی صورت میں پیش کیا اور اس پر پرشور تبصرے کیے۔ اردو اخبارات نے بال ٹھاکرے کی بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم کو یہ حق ہے کہ ہم دوسروں کے جاری کردہ اخبارات سے یہ تقاضا کریں کہ وہ ہمارے معاملات کی ترجمانی صحیح انداز سے کریں۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے کہ اردو صحافت اور اخلاقیات دونوں دو متضاد چیزیں ہیں جو کم از کم اب تک ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہوئیں۔

منصفانہ تجزیہ نہیں

صحافتی اخلاقیات کا ایک جز، منصفانہ تجزیہ اور حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے۔ مگر اردو صحافت میں منصفانہ تجزیہ اتنا کم یاب ہے کہ بدرجہ امکان ہی اس کے وجود کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ منفی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ کبھی مسائل کو بے لاگ انداز سے دیکھ نہیں سکتے، اور جو لوگ مسائل کو بے لاگ انداز سے نہ دیکھ سکیں ان کے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ مسائل کا منصفانہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں۔ اردو صحافت اس اصول کی بدترین مثال ہے۔

اردو زبان میں آج ہزاروں اخبار نکلتے ہیں اور ہر اخبار اپنی ہر اشاعت میں ایک اداریہ بھی ضرور شائع کرتا ہے۔ مگر یہ اداریے بمشکل ہی اس قابل ہوتے ہیں کہ کوئی پڑھنے والا ان کو پڑھے۔ ان تمام اداریوں کا ایک مشترک عنوان دینا ہو تو وہ "چیخ پکار" ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفروضہ تعصب اور امتیاز کے خلاف چیخ پکار کے سوا اردو اخبارات کے پاس کوئی اور بات ہی نہیں جس کو وہ اپنے تبصروں کا موضوع بنائیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے صرف کچھ سطحی لوگ دل چسپی لے سکتے ہیں، سنجیدہ لوگوں کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجیے۔

مئی ۱۹۸۵ میں یہ واقعہ ہوا کہ چاندمل چوپڑا نامی ایک شخص نے کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے خلاف ایک رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ قرآن تشدد کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے اس ملک میں اس کی اشاعت اور تقسیم کو قانونی طور پر بند کر دیا جائے۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے اس پٹیشن کو سماعت کے لیے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو جسٹس بی سی باسک نے وہ تاریخی فیصلہ دیا جو تمام اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

اس کیس کے بارے میں حسب معمول اردو اخبارات میں پرشور مضامین چھپے۔ ان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے اس قسم کی زبان استعمال کی کہ "چوپڑا کا کھوپڑا خراب ہو گیا ہے" اور ایسے بھی تھے جنھوں نے اس سے مختلف زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ تاہم سب کا مشترک خلاصہ ایک تھا ——— اس کے خلاف اندھا دھند احتجاج۔

کلکتہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے کئی ماہ بعد ستمبر ۱۹۸۵ میں ایک اردو جریدہ نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا:

"یہ ایک بڑا خوفناک واقعہ ہے جو پچھلے دنوں ہوا۔ عدالت نے اس استغاثہ پر کوئی باقاعدہ فیصلہ دینے کے بجائے معاملہ کو گول مول چھوڑ کر اس کو اپنے ریمارکس کے ساتھ محض روک دیا۔ گویا شرارت کا دروازہ اب بھی بند نہیں ہے۔"

جن لوگوں نے اصل فیصلہ کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو جریدہ کے یہ الفاظ سراسر واقعہ کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کلکتہ ہائی کورٹ نے معاملہ کو گول مول نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کو قطعی طور پر خارج کر دیا۔ جسٹس بمل چندر باسک کے ۱۸ صفحات کے فیصلہ کے آخر میں پیراگراف نمبر ۴ کو پڑھیے۔ اس میں واضح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں:

For the aforesaid reasons this application stands dismissed.

یعنی مذکورہ حقائق کی بنا پر یہ درخواست ڈسمس کی جاتی ہے۔

یہ اخلاق کی کون سی قسم ہے کہ عدالت کے ایک صحیح فیصلہ کا اعتراف نہ کیا جائے اور اس کے بارہ میں ایسے الفاظ لکھے جائیں جس سے اس کا وقار غیر ضروری طور پر مجروح ہوتا ہو۔ اس قسم کے صحافتی تبصرہ کو صحافتی تبصرہ کے بجائے صحافتی الزام کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

غیر تعمیری ذوق

۱۹۶۸ میں راقم الحروف نے لکھنؤ کے ایک ہفت روزہ میں ایک کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کالم میں میں نے مسلمانوں کے اندر "اپنی تعمیر آپ" کا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کا ایک نمونہ ماہنامہ الرسالہ کے قارئین الرسالہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ چند اشاعتوں کے بعد میرے بھیجے ہوئے مضامین مجھے بذریعہ ڈاک واپس کر دیئے گیے۔ ان مضامین کے ساتھ اخبار کے ایڈیٹر کا ایک خط تھا جس میں لکھا ہوا تھا:

"آپ کے مضامین ہمارے اخبار میں کھپ نہیں رہے ہیں۔"

اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ اخبار اس زمانہ میں پرشور طور پر احتجاجی سیاست چلا رہا تھا۔ احتجاجی سیاست کا مطلب اپنے مسائل کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے کر ان کے خلاف مطالبہ کی مہم چلانا ہے۔ جب کہ میں اپنے مضامین میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ مسلمانوں کا مسئلہ موجودہ زمانہ میں خود اپنی غفلت سے پیدا ہوا ہے، اور مسلمان اپنی تعمیر آپ کر کے ہی اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ قسم کی احتجاجی سیاست کے خانہ میں میرے تعمیری مضامین بالکل بے جوڑ تھے، چنانچہ محترم ایڈیٹر صاحب نے ان کو چھاپنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ جو لوگ اس قسم کا غیر حقیقت پسندانہ ذہن رکھتے ہوں وہ کبھی مسائل کا منصفانہ تجزیہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جدید اردو صحافت میں مجھے صرف ایک بزرگ معلوم ہیں جن کا ذکر میں اس اعتبار سے کر سکتا ہوں کہ وہ حقیقت پسندانہ اداریہ لکھنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آصف حسین قدوائی ہیں۔ وہ پندرہ سال پہلے لکھنؤ کے ایک ہفتہ وار اخبار میں پابندی کے ساتھ اداریے اور تبصرے لکھتے تھے۔ اہل علم طبقہ میں ان کے یہ مضامین نہایت اہتمام سے پڑھے جاتے تھے۔ میں خود پابندی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتا تھا۔

ڈاکٹر آصف حسین قدوائی کے مضامین کی نوعیت کو بتانے کے لیے میں ایک چھوٹی سی مثال دوں گا۔ ایک بار انھوں نے ہندستان کی مسلم سیاست پر ایک مفصل اداریہ لکھا۔ اس کا پہلا جملہ تھا:

"سیاست ممکنات کا کھیل ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جملہ اتنا قیمتی ہے کہ دورِ جدید کی تمام اردو صحافت پر بھاری ہے۔ مگر ڈاکٹر قدوائی کا بھی وہی انجام ہوا جو میرے تعمیری مضامین کا ہوا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مذکورہ اخبار سے الگ۔

ہوگیے اوراب لکھنؤ میں تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کا تعمیری نقطۂ نظر غالباً اردو کی احتجاجی صحافت میں کھپ نہ سکا اور انھیں اپنے آپ کو اس سے علٰحدہ کر لینا پڑا۔

فرقہ وارانہ فساد کے موضوع پر میرے کچھ مضامین ماہنامہ الرسالہ میں چھپے۔ اردو اخبارات کا عام ذہن یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہمیشہ غیر مسلم طبقہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ میں نے اس کے برعکس خود مسلمانوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ میں نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ اپنی اندرونی کمزوریوں پر قابو پاکر فسادات کے مسئلہ پر قابو پا سکتے ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت کے بعد ایک اردو صحافی مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ "لوگوں کا خیال ہے کہ آپ حکومت کی طرف سے ڈپیوٹ کیے گیے ہیں تاکہ فسادات کے معاملہ میں مسلمانوں کو قصوروار ثابت کریں"۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت کا ذہن کس قدر غیر تعمیری ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ اب اگر کوئی شخص تعمیری بات کہے یا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر پیش کرے تو اس کو لازمی طور پر مذکورہ بالا قسم کا تبصرہ سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

آخری بات

اخلاقیات کے اعتبار سے، اردو صحافت کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اردو صحافت مسلم مسائل کے ہم معنی بن گئی ہے۔ دونوں ایسا لازم ملزوم ہوگیے ہیں گویا مسلم مسائل کا نام اردو صحافت ہے اور اردو صحافت کا نام مسلم مسائل۔

اب اردو صحافت کو صحیح معنوں میں اخلاقی معیار پر لانے کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ اس کو نام نہاد مسلم مسائل سے جدا کر دیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں اردو صحافت مسلم مسائل کا ضمیمہ بن گئی ہے۔ اسی وابستگی کا یہ نتیجہ ہے کہ اردو صحافت نے ایک قسم کی وکیلانہ صحافت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ حقیقت پسندانہ صحافت نہ بن سکی۔ اگر کسی طرح دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے تو اردو صحافت ایک فرقہ کی صحافت سے اوپر اٹھ کر قومی صحافت کا درجہ حاصل کر لے گی۔ اس کی وہ کمزوریاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی جو اخلاقی اعتبار سے اس کی ترقی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہفتہ وار بلٹز کا اردو اڈیشن ہے۔ اردو بلٹز کے مالک غیر مسلم لوگ ہیں اور وہ اس کو کسی قدر آزاد انداز میں چلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اردو بلٹز دوسرے

ہفتہ وار اردو اخباروں سے کہیں زیادہ پڑھا جاتا ہے۔

ایک فرقہ وارانہ فساد کے بعد مجھے مختلف اردو اخبارات کو تقابلی طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ ہر اردو اخبار میں سب سے زیادہ ریلیف کے کاموں کو شائع کیا جا رہا ہے۔ مگر ہر اردو اخبار میں صرف اپنے حلقہ اور اپنی جماعت کے ریلیف کا کام شائع ہو رہا تھا۔ اگر کوئی شخص صرف ایک اخبار کو پڑھے تو اس کا تاثر یہ ہوگا کہ بس وہی ایک جماعت ریلیف کا کام کر رہی ہے جو اس اخبار کی مالک ہے۔ اس کے برعکس اردو بلٹز میں ہر جماعت اور ہر ادارہ کے ریلیف کے کاموں کا ذکر بلا امتیاز شائع ہو رہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ قارئین ریلیف کے کام کے بارے میں پوری بات کو جاننا چاہیں گے نہ کہ ادھوری بات کو۔ یہی وجہ ہے کہ اردو بلٹز کی اشاعت آج ہر دوسرے اردو ہفتہ وار سے بہت زیادہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو صحافت پر مسلمانوں کے قومی مسائل کا غلبہ ہے۔ اس غیر ضروری غلبہ نے اردو صحافت کو ایک قسم کی اخلاقی قید میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اردو صحافت کو اگر اس قید سے رہائی دیدی جائے تو اچانک وہ آفاقی وسعت حاصل کر لے گی۔ اردو صحافت کو زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان ہونا چاہیے نہ کہ محدود معنوں میں مسلمانوں کے قومی مسائل کا ترجمان۔ کسی شاعر کا یہ شعر اردو صحافت کی موجودہ صورت حال پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

نوٹ: اردو اکادمی دہلی کے تحت منعقد ہونے والے کل ہند سیمینار (غالب اکیڈمی نئی دہلی) میں ۹ فروری ۱۹۸۶ کو پڑھا گیا۔

ایک سفر

۱۹ مارچ ۱۹۸۶ کی شام کو مجھے دہلی سے پونہ جانا تھا۔ میں "رپورٹنگ ٹائم" پر ایر پورٹ پہونچا۔ ابتداءً انڈین ایر لائنز نے اطلاع دی کہ فلائٹ بالکل وقت پر ہے۔ مگر بعد کو بالکل آخر وقت میں اعلان ہوا کہ جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ اس ملک کا معاملہ عجیب ہے۔ بس سے سفر کیجیے تو بھیڑ کا خطرہ، کار سے سفر کیجئے تو ایکسیڈنٹ کا خطرہ، ٹرین سے سفر کیجئے تو چین پلنگ کا خطرہ۔ ہوائی جہاز سے سفر کیجئے تو یہ خطرہ کہ اچانک کسی "ٹکنکل سبب" سے جہاز لیٹ ہو جائے گا۔

یہ بلاشبہ وقت کا ضیاع ہے اور ناقابل بیان قومی نقصان ہے۔ تاہم ایمان ایک ایسی نعمت ہے جو آدمی کو ہر نقصان سے بچانے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ ہر چیز اس کے لیے خیر بن جاتی ہے۔ سب کچھ ٹھیک اندازہ کے مطابق ہو تو مومن کے اندر شکر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور اگر اس کا اندازہ بگڑ جائے تو وہ عرفتُ ربی بفسخ العزائم کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ ایمان کسی آدمی کے لیے اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی ناخوش گواریاں بھی خوش گواریوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

میرا ٹکٹ یکم مارچ کو انڈین ایر لائنز کے دہلی آفس سے خریدا گیا تھا۔ اس وقت اس کی قیمت ۲۱۲۸ روپیہ تھی۔ مگر اس کے بعد اعلان ہوا کہ ۱۸ مارچ سے انڈین ایر لائنز کی تمام پروازوں کے کرائے بڑھا دیئے گیے ہیں۔ میرا سفر ۱۹ مارچ کو شروع ہو رہا تھا۔ چنانچہ ایر پورٹ پر مزید ۱۳۶ روپے ادا کر کے بورڈنگ پاس ملا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں یہ اصرار کروں کہ میرے پاس جو ٹکٹ ہے اسی ٹکٹ پر مجھے سفر کا اجازت نامہ ملنا چاہیے تو یہ ناممکن ہے۔ یہ دنیا تبدیلیوں کی دنیا ہے۔ یہاں کبھی آدمی کو سابقہ ٹکٹ پر جگہ مل جاتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس ٹکٹ ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کو سواری میں جگہ نہیں دی جاتی جب تک وہ موجودہ ٹکٹ کے علاوہ اپنی اہلیت کا مزید ثبوت نہ دے۔ جو لوگ صرف اتنا جانتے ہوں کہ جب ایک ٹکٹ میری جیب میں ہے تو مجھ کو ضرور جگہ ملے گی، انھیں شکایت نہیں ہونی چاہیے اگر اس بدلتی ہوئی دنیا میں وہ اپنی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

ایک گھنٹہ انتظار کے بعد جہاز کے اندر داخل ہوئے۔ اس کے اندر اس کا میگزین

(سواگت مارچ ۱۹۸۶) تھا۔ میں اس کو لے کر پڑھنے لگا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈین ایر لائنز دنیا کی چند انتہائی وسیع قسم کی ایر لائنز میں سے ہے۔ اس کے پاس مختلف قسم کے جہازوں کا بہت بڑا دستہ ہے۔ وہ روزانہ ۲۴۰ سے زیادہ ہوائی سروس چلاتی ہے جو ملک کے ۷۲ مقامات پر اترتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیپال، پاکستان، افغانستان، سری لنکا، مالدیپ، بنکاک، بنگلہ دیش تک بھی اس کے جہاز جاتے ہیں۔ اس کے معاہدے مختلف انٹرنیشنل ہوائی کمپنیوں سے ہیں۔ اس لیے آپ جہاں کہیں بھی ہوں انڈین ایر لائنز کو آپ ہر جگہ اپنی خدمت کے لیے موجود پائیں گے:

So wherever you are Indian Airlines is always within reach.

جہاز ابھی ہوائی اڈہ پر کھڑا تھا اور میں اس میں داخل ہو کر اس کے میگزین میں یہ سب باتیں پڑھ رہا تھا کہ اچانک اعلان ہوا کہ تمام مسافر اس جہاز سے اتر جائیں۔ آپ لوگوں کو دوسرے جہاز سے پونہ لے جایا جائے گا۔ چنانچہ تمام مسافر جہاز سے اتر کر دوسرے جہاز پر سوار ہوئے۔ اس عمل میں مزید تاخیر ہوئی اور جہاز پورے دو گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔

جہاز کے میگزین میں یہ الفاظ نمایاں طور پر لکھے ہوئے تھے:

We wish you a comfortable journey.

اسی کے ساتھ ہندی رسم الخط میں اس کا ترجمہ ان الفاظ میں درج تھا: ہم آپ کی سکھد یاترا کے لیے کامنا کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ الفاظ بولنا کتنا زیادہ آسان ہے اور الفاظ کو عمل میں ڈھالنا اس کے مقابلہ میں کتنا زیادہ مشکل۔

جہاز کے اندر اپنا بیگ رکھنے کے لیے میں نے اپنی سیٹ کے اوپر لگا ہوا خانہ (Overhead locker) کھولا۔ مگر وہ چھوٹا تھا اور میرا ہینڈ بیگ اس میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ ایک مسافر نے مخالف سمت کے لاکر (خانہ) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں رکھ دیجیے۔ میں نے اس کو کھول کر دیکھا تو وہ بڑا تھا۔ چنانچہ اس میں میرا بیگ آسانی سے آ گیا۔ آدمی ہمیشہ اپنے مسئلہ کا حل اپنے سامنے کے مقام پر تلاش کرتا ہے۔ حالاں کہ اکثر حالات میں مسئلہ کا حل کسی اور مقام پر ہوتا ہے۔

پونہ کے لیے یہ میرا چوتھا سفر تھا۔ تاہم پونا والوں سے میں نے کہا کہ یہ شاید پونا کے لیے میرا آخری سفر ہو۔ میری عمر اگرچہ بہت زیادہ نہیں۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں قبل از وقت بوڑھا ہو گیا۔ اب

میرے اندر سفر کی طاقت نہیں رہی۔ پونا کے لیے میرے اب تک کے سفروں کی تاریخی تفصیل یہ ہے :

پہلا سفر	ستمبر ۱۹۷۱
دوسرا سفر	مارچ ۱۹۸۳
تیسرا سفر	ستمبر ۱۹۸۴
چوتھا سفر	مارچ ۱۹۸۶

پونہ میں مختلف پروگرام تھے۔ پچھلے سفر کے مقابلہ میں موجودہ پروگرام میں شرکاء کی تعداد کافی زیادہ تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مدّت میں اللہ کے فضل سے الرسالہ کے قارئین کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرے مقررین عوامی رجحان کی رعایت سے بولتے ہیں اس لیے ان کے اجتماع کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ مگر میری تقریر کا موضوع عوامی رجحان سے الگ ہوتا ہے۔ اس لیے میرا اجتماع اس بات کا پیمانہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کی آواز کتنی پھیلی ہے۔ پونہ کے ساتھی سب سے زیادہ زور الرسالہ کے قارئین کا حلقہ بڑھانے پر لگا رہے ہیں۔ ایک ساتھی نے کہا کہ الرسالہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کو صرف لوگوں کو دکھانے کی ضرورت ہے، اور اس کے بعد بیشتر لوگ اپنے آپ اس کے خریدار بن جائیں گے۔

ہمارے مشن میں اس وقت سب سے بڑا پروگرام الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے۔ جو لوگ پروگرام کے طالب ہیں ان کو الرسالہ کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھانے میں لگ جانا چاہیے۔

پونا کی کل آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ اس میں مسلمان تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ ایک لاکھ کی تعداد کسی بھی کام کو کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ مگر پونہ کے مسلمانوں کا حال بھی وہی ہے جو دوسرے شہروں کے مسلمانوں کا ہے۔ تعمیری کام سے زیادہ آپس کے اختلافات اور بے فائدہ مظاہروں میں اپنی طاقت ضائع کرنا۔ اسی پونہ میں عیسائی ان سے کم تعداد میں ہو کر ان سے بہت زیادہ تعمیری کام کر رہے ہیں۔ مگر مسلمان علین ان کے پڑوس میں پسماندگی کا نشان بنے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ساری مسلم دنیا میں نہایت زور و شور کے ساتھ بے فائدہ منفی سرگرمیاں جاری ہیں۔ تبلیغی جماعت جیسی بعض انتہائی مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر سب کا یہی حال ہے۔ ہر ایک کے پاس ایک جھوٹا اسلام ہے اور وہ اس کا جھنڈا اٹھا کر اپنے آپ کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔

پونا میں ایک ہندو بلڈر نے ایک اونچی عمارت بنائی جس میں بہت سے فلیٹ تھے۔ اب فوراً

مسلمانوں کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ ان کے گھروں کی بے پردگی ہوگی۔ چنانچہ اس کے خلاف مہم شروع ہوگئی۔ بلڈر نے کہا کہ تمہارا فلاں لڑکیوں کا اسکول ہے وہاں خود مسلم اسکول کے مالکوں نے اسی قسم کی اونچی بلڈنگ بنائی ہے اور اس کے فلیٹ لوگوں کو کرایہ پر دیئے ہیں تو کیا اس کے ذریعہ تمہارے گرلز اسکول کی بے پردگی نہیں ہوتی۔ پھر وہاں تم اسی قسم کا ایجی ٹیشن کیوں نہیں چلاتے۔ ایجی ٹیشن ختم ہوگیا اور بلڈنگ بدستور اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہے۔

اسی طرح پونا میں ایک مسجد ہے جس کا نام ہے "مسجد منشیان"۔ یہ مسجد سڑک کے کنارے ہے۔ یہاں سڑک کے دوسری طرف کسی قدر فاصلہ پر ایک ہوٹل بنایا گیا ہے جس کا نام سلوران (Silver Inn) ہے۔ اس ہوٹل میں ایک پرمٹ روم (Permit room) بھی ہے۔ یعنی سرکاری لائسنس کے تحت شراب پینے کا کمرہ۔ اب مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ اس سے مسجد کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ۲۶ جنوری ۱۹۸۵ کو کالا دیوس (کالا دن) کے طور پر منائیں گے۔ پوسٹر نکالے گئے۔ نعرے بلند کیے گیے۔ اور ۲۶ جنوری کو بہت سے مسلمان ہوٹل کے سامنے منڈپ ڈال کر بیٹھ گیے کہ ہم اس وقت تک بھوک ہڑتال کریں گے جب تک یہ "شراب خانہ" بند نہ کر دیا جائے۔

کچھ مسلمان یہاں کے مراٹھی اخبار (تڑن بھارت) کے دفتر میں گیے تاکہ وہاں اپنے اسلامی احتجاج کی خبر چھپوائیں۔ اس کے ایڈیٹر نے کہا کہ ہوٹل والوں نے تمہاری مسجد سے کافی فاصلہ پر سرکاری اجازت کے تحت شراب خانہ کھولا ہے۔ اور دوسری طرف تمہاری اس مسجد سے قریب ہی دوسری مسجد ہے اس کی عین دیواروں کے نیچے خود مسلمانوں نے بلا اجازت شراب کا دھندا کھول رکھا ہے تو تم اس کو بند کرنے کی مہم کیوں نہیں چلاتے۔ دوبارہ یہی ہوا کہ ہوٹل کا "پرمٹ روم" بدستور موجود ہے اور مسلمانوں کی احتجاجی مہم ایک دن کے شور و شر کے بعد ختم ہوگئی۔

پونا کے پہلے سفر میں میں نے ڈی نابلی کالج دیکھا تھا جو عیسائیوں کا عظیم الشان ادارہ ہے۔ اس بار کے سفر میں "گیان پربودھنی" دیکھا جو ہندو صاحبان کا بہت بڑا ادارہ ہے۔ اس طرح کے درجنوں بڑے بڑے ادارے ہیں جو یہاں دوسری قوموں نے قائم کر رکھے ہیں اور ان کے ذریعہ سے اپنی تعمیر و ترقی کے کام میں مسلسل مصروف ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ دیواروں کے اوپر الفاظ

کی لکیریں بنا کر خوش ہو رہے ہیں۔ پونا کی کچھ گندی اور ٹوٹی ہوئی دیواروں پر " اسلامی نعرے " لکھے ہوئے نظر آئے۔ اگرچہ ان کی بدخطی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ مجھ کو نہ پڑھو۔ وہ نعرے یہ تھے :

اٹھو نوجوانو، اسلام کو تمہاری ضرورت ہے، شریعت خطرے میں ہے

یکساں سول کوڈ مردہ باد، شریعت زندہ باد۔ ہمیں چاہیے شریعت کورٹ

ایک لیڈر صاحب سے میں نے کہا کہ اس قسم کے نعروں اور پوسٹروں سے کیا فائدہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو کچھ نوجوانوں نے کیے ہیں۔ میں نے کہا کہ نوجوانوں نے اس لیے کیا ہے کہ لیڈر صاحبان ان کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ایک سیدھے سادے تاجر اس وقت ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا آپ بالکل درست کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اوپر والے حمایت کرتے ہیں تبھی نیچے والوں کو کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ اوپر والے اگر شوشہ نہ چھوڑیں تو نیچے والے بالکل ٹھیک رہیں گے۔

گیان پربودھنی (پونا) ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ یہ لوگ نہایت خاموش کام میں مصروف ہیں۔ وہ حکومت سے کوئی امداد نہیں لیتے۔ ان کا بہت بڑا بجٹ ہے مگر اس کا کچھ حصہ قومی چندوں سے پورا ہوتا ہے اور کچھ ان کے اپنے صنعتی اور زراعتی شعبوں سے آتا ہے۔

ان کے مختلف کام ہیں۔ مثلاً ایک کام یہ ہے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے ہندو نوجوانوں کو منتخب کر کے انھیں آئی اے ایس (I.A.S.) کے امتحان کے لیے تیار کرتے ہیں۔ یہی لوگ بعد کو حکومت کے کلیدی مناصب پر قبضہ کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ پورے انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ پھر اسی ادارہ سے آر ایس ایس جیسی تنظیموں کو بھی اعلیٰ کارکن مل رہے ہیں۔ وغیرہ

گیان پربودھنی کی کئی منزلہ بلڈنگ میں نیچے کے حصے میں ایک بڑا ہال ہے۔ اس میں ہر صبح کو اس کے تمام اساتذہ اور طلبہ اور کارکن جمع ہوتے ہیں اور پوجا اور پرارتھنا کرتے ہیں۔ ہال کی ایک دیوار پر پورے بھارت (ہندستان) کی ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ اسی کو سامنے رکھ کر وہ اپنے مراسم ادا کرتے ہیں۔ اس تصویر کے نیچے مراٹھی زبان میں لکھا ہوا ہے :

ماتر بھومی ہی خدا ہے۔ اسی کی ہمیں پوجا کرنا ہے۔

یہ گویا آر ایس ایس کا کلمہ ہے۔ اس سے آپ آر ایس ایس کی تحریک کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دراصل " بھارت " کی برتری کے تصور پر اٹھی ہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے " بھارت " کو مقدس معبود کا درجہ دیدیا

ہے۔ آر ایس ایس کے دوسرے تمام مظاہر اس کے اسی مخصوص عقیدہ کا نتیجہ ہیں۔

پندرہ سال پہلے میں نے گرو گولوالکر کی کتاب گلدستۂ خیال (Bunch of Thought) پڑھی تھی جو گویا آر ایس ایس تحریک کی بائبل ہے۔ اسی وقت میں نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ ترجمہ ابھی تک میرے پاس غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہ تحریک کم از کم اپنی موجودہ حالت میں مسلمانوں کی تقسیم کی تحریک کا رد عمل ہے۔ اس کے نزدیک بھارت ایک مقدس جغرافی وحدت ہے۔ اس کا وہی درجہ ہے جو مذہبی اصطلاح میں معبود کا درجہ ہونا چاہیے۔ ایسی حالت میں اس فکر کے نزدیک یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے کہ اس مقدس وحدت کے ٹکڑے کیے جائیں یہ فکر بلاشبہ ہندستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس نے ہندستانی باشندوں کی ایک بڑی تعداد کے اندر مستقل طور پر منفی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور منفی ذہنیت سے زیادہ تباہ کن اس دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو چیز مقدس بن جائے اس کو آدمی کبھی عقلی معیاروں پر نہیں جانچتا۔ اس لیے ان حضرات کا یہ احساس غالباً اس وقت تک باقی رہے گا جب تک موجودہ صورت حال باقی ہے۔

مسلمان اس معاملہ میں ہمیشہ مذکورہ فکر کو الزام دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں سب سے بڑے ملزم خود مسلمان ہیں۔ اقبال اور دوسرے حضرات نے ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل ملکی تقسیم میں دریافت کیا۔ مگر ہندو مسلم مسئلہ کا یہ حل کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے، موجودہ حالات میں اتنی بڑی نادانی تھی کہ شاید پوری انسانی تاریخ میں اتنی بڑی نادانی کبھی نہیں کی گئی۔ یہ بلا تشبیہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سنی اور شیعہ کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کرے کہ کعبہ کو دو ٹکڑے کر کے دونوں فرقوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ ایسا حل مسئلہ کو صرف شدید تر بناتا ہے ایک ایسا ملک جس کے باشندے اپنے ملک کو خدا سمجھ کر اس کو پوجتے ہوں وہاں مسئلہ کا حل اہلِ ملک کی سوچ کو بدلنا تھا نہ کہ ملک کی جغرافی سرحد کو بدلنا۔ موجودہ صورت حال میں ملک کی تقسیم صرف مسئلہ کی شدت میں اضافہ کرتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اصل مسئلہ کو حل نہیں کرتی۔

کیسے عجیب تھے وہ مفکرین اسلام جن کو اسلام نے صرف یہ بتایا کہ وہ ایسے کانٹے کی فصل بوئیں جس کے کانٹے کبھی ختم نہ ہو سکیں۔

پونہ میں ایک ہندو ادارہ ہے جس کا نام ہے ساد ھو آسوانی مشن۔ وہ مختلف قسم کے علمی کام کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے ایک منصوبہ کا نام ہے : (Life Beyond Project) یہ پروجکٹ گویا آواگمن کے نظریہ کو عقلی اور سائنسی طور پر ثابت کرنے کی ایک منظم کوشش ہے۔ یہ کام وہ عالمی سطح پر انجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح پونہ میں ایک ادارہ (بسنت وکھیان مالا) ہے جو ہر سال چھٹیوں کے موسم (ماہ مئی) میں ایک مہینہ تک ہر روز مذہبی اور تاریخی موضوعات پر لکچر کراتا ہے۔ اس کے لیے سارے ملک سے اعلیٰ قابلیت کے لوگ بلائے جاتے ہیں۔ اس میں داخلہ کے لیے ٹکٹ ہوتا ہے جس کو ہر آدمی قیمت دے کر خریدتا ہے۔ اس کے باوجود بڑا ہال آخری حد تک بھرا ہوتا ہے : دہلی وغیرہ۔

ہندو قوم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر رُخ پر کام کرتی ہے۔ اس کے کچھ افراد اگر ایک کام کرتے ہیں تو اس کے دوسرے افراد دوسرے کام کو سنبھال لیتے ہیں۔ مثلاً گاندھی جی نے سودیشی کپڑے کے بائیکاٹ (۱۹۲۱) کی مہم چلائی تو ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی اس مہم میں پوری طرح شریک تھے۔ مگر ہندوؤں نے اگر ایک طرف لنکاشائر اور مانچسٹر کے کپڑے جلائے تو دوسری طرف سیکڑوں کی تعداد میں ملک کے اندر کپڑے کی ملیں بھی قائم کر دیں۔ جب کہ مسلمان صرف باہر کے کپڑے جلاتے رہے اور انھوں نے کپڑے کی ایک مل بھی قائم نہ کی۔

یہی انداز پوری جدید تاریخ میں مسلمانوں کا نظر آتا ہے حتیٰ کہ اب ان کا مزاج ایسا ہو گیا ہے کہ تخریب کے کام کے لیے انھیں نہایت آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ مگر تعمیر کے کام کے لیے پکارا جائے تو وہ ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

اسی صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں جو آدمی مقبولیت چاہتا ہے وہ فوراً ایک منفی نعرہ لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کریڈٹ وصول کرتا ہے کہ اس نے عظیم الشان اسلامی اتحاد قائم کر دیا ہے۔ مثبت پروگرام کے لیے اٹھنا اپنی قیادت کو کھونے کی قیمت پر ممکن ہے جس کا ایک نمونہ موجودہ زمانہ میں فرانس کے چارلس ڈیگال نے پیش کیا ہے۔ مگر ہمارے درمیان کوئی "ڈیگال" نہیں۔ اسی لیے ہمارے درمیان ابھی تک یہ ممکن نہ ہوا کہ کوئی قائد خود مر کر قوم کو نئی زندگی عطا کر دے۔

پونہ کے قیام میں برابر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ کئی تقریری پروگرام ہوئے جس کی تفصیل نیچے درج ہے۔

پونہ میں تلک سمارک ہال، یہاں کا سب سے زیادہ بڑا اور مشہور ہال ہے۔ ۲۰ مارچ کی شام کو یہاں عمومی اجتماع ہوا۔ اس میں پونہ کے میئر بھی شریک ہوئے۔ مسلمانوں کے علاوہ تعلیم یافتہ غیر مسلموں کی معقول تعداد بھی ہال میں موجود تھی۔ اس تقریر کا عنوان مقامی منتظمین نے حسب ذیل مقرر کیا تھا:

دورِ جدید کا بانی: پیغمبر اسلام

اس موضوع پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تقریر ہوئی۔ لوگ آخر تک نہایت دلچسپی اور انہماک کے ساتھ سنتے رہے۔ ہندو صاحبان نے کہا کہ "ہم نے اب تک ایسا کوئی مولوی نہیں دیکھا تھا۔ ہم کو معلوم ہی نہ تھا کہ اسلام کا یہ مطلب بھی ہے۔ کئی ہندو صاحبان نے بک اسٹال سے انگریزی کتابیں خریدیں اور پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ بھی خریدا۔ منتظمین نے اس موقع کے لیے الرسالہ کے کچھ اقتباسات کا مرہٹی ترجمہ کرکے ایک پمفلٹ شایع کیا تھا۔ یہ مرہٹی پمفلٹ لوگوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔

پونہ میں پروگرام

۱	۱۹ مارچ ۱۹۸۶	بعد نماز عشار	قارئین الرسالہ سے خطاب	مکہ مسجد
۲	۲۰ مارچ	بعد نماز فجر	درسِ قرآن	مکہ مسجد
۳	۲۰ مارچ	۱۲ بجے دن	ملاقات اور معائنہ	گیان پربودھنی (ہندو ادارہ)
۴	۲۰ مارچ	۶ بجے شام	مسلم و غیر مسلم مشترک اجتماع	تلک سماک مندر
۵	۲۰ مارچ	بعد نماز عشار	تاجر طبقہ سے خطاب	میمن جماعت خانہ
۶	۲۱ مارچ	بعد نماز فجر	درسِ قرآن	مکہ مسجد
۷	۲۱ مارچ	قبل نماز جمعہ	خطاب عام	مکہ مسجد
۸	۲۱ مارچ	بعد نماز عشار	خطاب عام	جامع مسجد ایروڑا
۹	۲۲ مارچ	بعد نماز فجر	درسِ حدیث	مکہ مسجد

تلک سمارک ہال کے قواعد کی وجہ سے اس کا پروگرام مغرب سے کچھ پہلے شروع کیا گیا تھا۔ ابھی میری تقریر جاری تھی کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ اس وقت تقریر کو روک کر ہال کے باہر نماز باجماعت ادا کی گئی۔ مسلم سامعین نماز کے لیے اٹھ گیے۔ غیر مسلم سامعین کے لیے یہ ایک نامانوس واقعہ تھا۔ تاہم وہ سب کے سب اپنی سیٹ پر انتظار میں بیٹھے رہے اور جب ہم لوگ نماز ادا کرکے آئے تو انھوں نے اس کو اصول پرستی قرار دے کر اس کی تحسین کی۔ غیر مسلم حاضرین میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جو اٹھ کر چلا جائے۔

ایک ہندو ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کے لیڈروں نے اسلام کو سیاست بنا دیا۔ اس لیے دوسری قومیں اس سے بھڑک گئیں۔ اگر اسلام کو اس طرح سائنٹفک انداز میں پیش کیا جائے جس طرح آپ نے پیش کیا ہے تو آپ دوسری قوموں میں بہت لوگوں کو اپنا ہمدرد پائیں گے۔

پونا میں الرسالہ اور الرسالہ کی دعوت خدا کے فضل سے تیزی سے پھیل رہی ہے۔ منتظمین اجتماع میں سے ایک شخص نے کہا، آپ کے پچھلے سفر کے مقابلے میں اس بار ہم نے بہت کم پبلسٹی کی۔ مگر اس بار پہلے سے بہت زیادہ آدمی آپ کی ہر تقریر میں شریک ہوئے۔ جمعہ (۲۰ مارچ) کو جمعہ سے پہلے ایک جامع مسجد میں تقریر رکھی گئی تھی۔ وہاں پہونچا تو الرسالہ کا یہ جملہ مسجد کے بورڈ پر نمایاں حروف میں لکھا ہوا تھا:

بلند مقام اپنے آپ کو بلند کرنے سے ملتا ہے نہ کہ نعرے اور جھنڈے بلند کرنے سے

مسجد میں عام جمعہ سے تقریباً دگنا زیادہ آدمی تھے۔ وسیع مسجد بالکل بھری ہوئی تھی۔ یہی ہر پروگرام کا حال رہا۔

ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ الرسالہ کو علاقائی زبانوں میں بھی شائع کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مثلاً مرہٹی یا گجراتی مسلمانوں کی ۵۷ فی صد تعداد صرف مرہٹی یا گجراتی زبان پڑھ سکتی ہے۔ وہ اردو میں نہیں پڑھ سکتی۔ تاہم وہ آسان اردو جانتے ہیں اور سن کر اسے سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ضرورت ہے کہ الرسالہ کو ان کے اپنے رسم خط میں شائع کیا جائے۔ یعنی الرسالہ کے مضامین کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ اس کے اردو مضامین ہی کو رسم الخط بدل کر شائع کر دیا جائے تو یہ سلسلہ بہت مفید ہوگا۔ اس سے نہ صرف مسلمانوں کو فائدہ ہوگا بلکہ بہت سے غیر مسلموں کے لیے بھی وہ مفید ہوگا۔ کیونکہ غیر مسلموں میں ایسے لوگ بہت ہیں جو اردو سمجھ لیتے ہیں مگر وہ اس کو پڑھ نہیں سکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج کل صرف وہی اخبار یا رسالہ چل پاتا ہے جس کی پشت پر کوئی بڑا ادارہ ہو۔ جس رسالہ کو بھی آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے پیچھے کوئی اور ہے :

The person behind that is someone else.

انھوں نے کہا کہ الرسالہ اتنی شان کے ساتھ دس برس سے برابر نکل رہا ہے تو اس کا اسپانسر کون ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا اسپانسر خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ انھوں نے کہا : پھر تو یہ معجزہ ہے۔

الرسالہ کے ایک قاری سے میں نے ان کا تاثر پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ تو ایسا پرچہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد دل دہلنے لگتا ہے۔ ایک صاحب نے حال میں " اللہ اکبر " پڑھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کو پڑھنے کے بعد مجھے ہر طرف آخرت کا منظر دکھائی دینے لگا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی زمانہ میں میں ٹیلی وژن پر ایک جغرافی فلم دیکھ رہا تھا۔ اس میں آتش فشاں کے پھٹنے کا منظر دکھایا گیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ زمین پھٹی اور اس کے اندر سے آگ ابل پڑی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ آگ خود میرے قدموں کے نیچے سے اُبل رہی ہے۔ اس سے پہلے میرا یہ حال نہ تھا۔

ایک لیڈر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کی عمومی دعوت کی راہ میں مسلمانوں کی بے عملی حائل ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کہہ کر آپ اپنا الزام دوسروں کے اوپر ڈالنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی عمومی دعوت کی راہ میں قومی منافرت حائل ہے نہ کہ مسلمانوں کی بے عملی۔ قومی منافرت کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیڈروں پر ہے جو اپنی جھوٹی سیاست کی وجہ سے اس کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کسی طرح اس کو ختم نہیں ہونے دیتے۔ میں نے کہا کہ اگر اس ملک کے باشندوں کے سامنے اسلام کو بحیثیت ایک دعوت کے لے آنا ہے تو ہمیں مطالبات اور احتجاج کی سیاست کو یکسر ختم کر دینا ہوگا۔

لیڈر صاحب نے فرمایا کہ اگر دونوں جاری رہیں تو کیا حرج ہے۔ یعنی ہم اپنے حقوق کی لڑائی بھی لڑیں اور اسلام کی دعوت بھی لوگوں تک پہونچائیں۔ میں نے کہا کہ یہ آپ صرف اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو دعوت کا درد نہیں۔ اگر آپ ایک تاجر سے یہ کہیں کہ تم اپنا سودا بھی بیچو اور گاہکوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا بھی جاری رکھو تو وہ آپ کا مشورہ قبول کرنے کے بجائے خود آپ کو یہ مشورہ دے گا کہ آپ دماغی امراض کے ڈاکٹر سے رجوع فرمائیں۔ کیوں کہ ایسی تجارت اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اسی طرح ایسی اسلامی دعوت ممکن نہیں جس میں دعوت بھی دی جائے اور اسی کے ساتھ داعی اور مدعو کے درمیان جھگڑے کی سیاست

بھی چلائی جاتی رہے۔

ایک اجتماع میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ ہمارے قائدین پر تنقید کرتے ہیں۔ حالاں کہ مسلم پرسنل لا کے مسئلہ پر انھوں نے حال میں جو تحریک چلائی اس نے نہایت شاندار اسلامی اتحاد پیدا کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ ہاں سفر سے پہلے دہلی میں مجھے ایک اخبار (۱۰ مارچ ۱۹۸۶) ملا تھا۔ اس کے اداریہ کی سُرخی تھی "ملت کا بے نظیر اتحاد"۔ اس کے بعد اس حلقہ کے ایک بزرگ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے مذکورہ اخبار دکھا کر ان سے پوچھا کہ یہ بے نظیر اتحاد کہاں واقع ہے۔ جلسہ جلوس کے مظاہروں میں یا مسلمانوں کی اپنی زندگیوں میں۔ اس سوال پر مذکورہ بزرگ بگڑ گئے۔ میں نے کہا کہ یہ پہلا ثبوت ہے کہ اسلامی اتحاد ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے۔ کیوں کہ اسلامی اتحاد حقیقۃً اپنی بے اتحادی کو ختم کرنے کا نام ہے۔ اسلامی اتحاد ایک شعوری حالت ہے، یہ شعوری حالت کہ قوم کے افراد اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا سیکھ لیں۔ مگر آپ نے ایک سیدھے سے سوال پر خفا ہو کر یہ ثبوت دیا ہے کہ آپ اس شعوری حالت کو ابھی نہیں پہونچے۔

پھر میں نے کہا کہ جو چیز وقوع میں آئی ہے وہ صرف بھیڑ بھاڑ ہے۔ مگر آپ لوگ غلط فہمی سے اس کو اتحاد سمجھ رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ یہ جملہ بولیں کہ "بے نظیر بھیڑ بھاڑ" تو مجھے کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ مگر جب آپ اس کو "بے نظیر اتحاد" کا نام دیں تو میں کہوں گا کہ بطور واقعہ یہ بیان صحیح نہیں۔

مختلف نوجوانوں نے آٹوگراف کے لیے کہا۔ ایک صاحب کو میں نے لکھا:

کسی چیز کو پانے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی اس چیز کا طالب ہو۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہے اور آدمی جب تک اس کی مطلوبہ قیمت ادا نہ کرے وہ اس دنیا میں اپنی مطلوبہ چیز کو نہیں پا سکتا۔

ایک صاحب نے نصیحت کے لیے کہا۔ میں نے کہا:

مصیبتیں بالعموم زندگی کی قیمت ہیں۔

کچھ نوجوانوں سے میں نے کہا:

جو آپ کے دل میں ہے وہی زبان سے بولیے۔ جو کچھ آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسرے کے لیے پسند کیجیے۔ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے یہ سمجھیے کہ آپ خدا سے معاملہ

کورہے ہیں۔

ایک صاحب نے کسی کا مقولہ بتایا جو قابل نقل ہے :

In everything look before you leap.
But in charity leap before you look.

دوسری ہر چیز میں اقدام سے پہلے سوچو۔ مگر خیر کے کام میں پہلے اقدام کرو، اس کے بعد سوچو۔

ایک صاحب ایران میں کچھ سال رہ کر واپس آئے تھے۔ انھوں نے بہت سی مثالیں دے کر بتایا کہ جدید فارسی اور قدیم فارسی میں زبان کے اعتبار سے کافی فرق پیدا ہوچکا ہے۔ مثلاً بلے کو وہ لوگ بالے کہتے ہیں۔ ہم لوگ کہتے ہیں کہ تکلف نہ کیجیے وہ لوگ کہتے ہیں : تعارف مکن (تکلف نہ کیجیے) تکلف کو وہ لوگ تکلیف کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، وغیرہ۔

۲۲ مارچ ۱۹۸۶ کی شام کو میں پونہ سے واپس آیا۔ جہاز کے اندر انڈین اکسپریس کا مدراس ایڈیشن پڑھنے کو ملا۔ اس کے صفحہ ۳ پر ایک دلچسپ خبر یہ تھی کہ ۲۱ مارچ کو مدراس اسمبلی کا اجلاس تھا۔ بجٹ پر تقریریں ہورہی تھیں۔ کانگریس آئی کے ایک ممبر مسٹر اے ارو موگم کھڑے ہوئے تو انھوں نے دوران تقریر ہندی زبان کو ریاست میں ترقی دینے پر زور دیا۔ وہ انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کررہے تھے :

When Finance Minister Nedunchezhiyan asked the member if he had any knowledge of Hindi, he replied: chota chota maloom hai. (I know a little)

جب وزیر مالیات نے مذکورہ ممبر سے پوچھا کہ کیا وہ کچھ ہندی جانتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: چھوٹا چھوٹا معلوم ہے (تھوڑا تھوڑا معلوم ہے)

معزز ممبر کے ذہن میں انگریزی کا لفظ (Little) تھا۔ اسی کا ہندی ترجمہ کرکے انھوں نے کہدیا کہ ہاں، چھوٹا چھوٹا معلوم ہے۔ حالاں کہ ہندی میں اس کے لیے صحیح لفظ تھوڑا ہے نہ کہ چھوٹا۔ آدمی جو کچھ بولتا ہے، اکثر وہ اس کے اپنے ذہن کی ترجمانی ہوتی ہے۔ مگر وہ بطور خود یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ خارجی حقیقت کی ترجمانی کررہا ہے۔

۱۔ پونہ میں مارچ ۱۹۸۶ کے تیسرے ہفتہ میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں مقامی افراد کے علاوہ قریب کے دوسرے علاقوں کے لوگ بھی شریک تھے ۔ صدر اسلامی مرکز کی اس موقع پر کئی تقریریں ہوئیں ۔ اس کی تفصیلی رپورٹ سفرنامہ میں شائع کر دی جائے گی۔ انشاء اللہ

۲۔ بعض مقامات پر الرسالہ کے ہمدرد " الرسالہ ٹیلی فون فری لائبریری " کی اسکیم چلا رہے ہیں ۔ یعنی قاری ٹیلی فون پر اپنی طلب نوٹ کرا دے اور اس کو اس کے دیئے ہوئے پتہ پر الرسالہ یا اس کی مطلوبہ کتاب پہونچا دی جائے ۔ یہ اسکیم بہت مفید ہے اور اس قابل ہے کہ ہر بڑے شہر میں اس کو چلایا جائے ۔

۳۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۶ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے بعض احادیث کی روشنی میں ایمان ویقین کی وضاحت کی ۔

۴۔ ۵ اپریل ۱۹۸۶ کو سعودی عرب کے ایک وفد نے اسلامی مرکز کی زیارت کی ۔ اس وفد میں ڈاکٹر عبد المحسن الترکی (ریکٹر جامعۃ الامام ریاض) ڈاکٹر عبد الحلیم عویس ، ڈاکٹر محمود شوق اور دوسرے اعلیٰ افراد شامل تھے ۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے تبادلۂ خیال کیا اور مرکز کے کاموں کو دیکھا۔ وہ مرکز کے علمی اور تعمیری کاموں سے کافی متاثر ہوئے ۔

۵۔ خدا کے فضل سے الرسالہ (انگریزی) کا افریقی اڈیشن شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ایک بڑے ادارہ نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے ۔ پہلا شمارہ انھوں نے مارچ ۱۹۸۶ کا شائع کیا ہے ۔ اس کے بعد وہ ہر ماہ اسی طرح چھاپتے رہیں گے ۔ دہلی سے شائع ہونے والے پرچہ کا عکس لے کر ہو بہو ویسا ہی وہ اُسے شائع کر رہے ہیں ۔

۶۔ بھوپال میں اپریل ۱۹۸۶ میں حلقہ الرسالہ کے تحت ایک اجتماع ہوا جس میں مرکز سے صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی ۔ تمام پروگرام غیر معمولی طور پر کامیاب رہے ۔ اس اجتماع کی تفصیلی رپورٹ سفرنامہ میں شائع کر دی جائے گی ۔ انشاء اللہ ۔

۷۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اسلامی مرکز کا مشن تیزی سے ترقی پر ہے ۔ وہ دوسرے تمام افکار کو مغلوب کرتا جا رہا ہے ۔ حتی کہ اب وہ لوگ بھی انھیں اصطلاحوں میں بولنے لگے ہیں جو پہلے

صرف اسلامی مرکز کی منفرد آواز سمجھی جاتی تھی اور دوسرے لوگ اس کو بزدلی اور انفعالیت سے تعبیر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں برابر مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً لکھنؤ کے تعمیر حیات (۲۵ مارچ ۱۹۸۶) میں ایک مشہور مسلم قائد کی تقریر شائع ہوئی ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے اپنے سابقہ انداز کے خلاف انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "کامیابی کی ضمانت خواہشات نہیں حقائق ہیں" یہ دنیا واقعات اور حقائق کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں بقا اس کے لیے ہے جو نفع بخش ثابت ہو۔ حقیقت کے انکار نہیں بلکہ حقیقت کے اعتراف سے زندگی ملتی ہے" یہ واضح طور پر اسلامی مرکز کے موقف کی صداقت کا اعتراف ہے۔ قائد موصوف نے عین اسلامی مرکز کی بات دہرائی ہے، اگرچہ حوصلہ کی کمی کی بنا پر اعلان کے بغیر۔

۸۔ مختلف مقامات پر الرسالہ کے نام سے مقامی تنظیمیں قائم کی گئی ہیں۔ مثلاً کسی مقام پر الرسالہ فرینڈس سرکل اور کہیں الرسالہ ریڈرس ایسوسی ایشن۔ وغیرہ۔ یہ ایک اچھا سلسلہ ہے اور مقامی حالات کے اعتبار سے ہر جگہ اس کا تجربہ کیا جانا چاہیے۔

۹۔ بعض مقامات پر ہمدردانِ الرسالہ ایک مفید اسکیم چلا رہے ہیں۔ وہ اپنے شہر یا آس پاس کے کئی سو آدمیوں کے پتہ کی فہرست بناتے ہیں۔ ان کو اپنے پاس سے الرسالہ چند ماہ تک بھیجتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملاقات کرکے الرسالہ کے بارہ میں ان کا تاثر پوچھتے ہیں اور ان کو الرسالہ کی خریداری پر یا اس کی ایجنسی لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت مفید اسکیم ہے اور ہر جگہ اس کو اپنے حالات کے اعتبار سے اختیار کیا جانا چاہیے۔

۱۰۔ اسلامی مرکز کی مطبوعات خدا کے فضل سے قوم کے اعلیٰ ترین ذہنوں میں خاموش انقلاب پیدا کر رہی ہیں۔ اس کی مثالیں ہر روز سامنے آتی رہتی ہیں۔ یہاں چند خط نقل کیے جاتے ہیں۔ ایک صاحب کتاب "اللہ اکبر" پڑھنے کے بعد اپنے خط (۲۰ مارچ ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں "آپ کا حکم تھا کہ میں اللہ اکبر کے بارہ میں اپنا تاثر دوں۔ میرے پاس اتنے معقول الفاظ نہیں ہیں کہ میں کچھ لکھوں۔ کاش مجھے آنسوؤں کی زبان لکھنا آتی اور کوئی اس کو پڑھ سکتا۔ بس خدا سے دعا کیجئے کہ وہ میرے گناہوں کو بخش دے اور اپنی رحمت میں مجھے رکھے اور جہنم کے عذاب سے بچائے۔ زندگی میں پہلی بار انسان ہونے کا احساس ہوا ہے۔ کتنا خوف ناک ہے

انسان کے ساتھ خدا کا معاملہ کہ میرے ہر عمل کا جواب اسے دینا ہے۔ کاش میں کوئی ایسی چیز ہوتا کہ خدا مجھ سے کچھ نہ پوچھتا۔ بس اس کے بڑے ہونے کا سہارا ہے کہ وہ بخشے گا میرے گناہ کو، اور وہی بچائے گا جہنم کے عذاب سے۔

(حبیب بھائی، حیدرآباد)

۱۱۔ والدین اور استادوں کی رہبری سے محروم ہونے کے بعد بڑی تنہائی محسوس کر رہا تھا اور زندگی ایک تپتے ریگستان و صحرا کا سفر معلوم ہو رہی تھی اور ہر طرف ایک سراب۔ لیکن اس عرصہ میں آپ کی تصنیفات 'الرسالہ' کے مضامین میرے لیے ایک بڑے سایہ دار درخت ثابت ہوئے اور میں اس سفر سے تھکا ہوا آرام سے آپ کی شفیق چھاؤں تلے بیٹھ کر پھر تازہ دم اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ نیا عزم، ایک حوصلہ، ایک سنت، ایک مہربانی، ایک خلوص، ایک سچائی اور رہبری پاتا ہوں۔ جس طرح روزانہ خوراک ضروری ہے اسی طرح الرسالہ ضروری روحانی خوراک بن چکا ہے۔ حوصلہ مند زندگی و توانائی کے لیے۔

۱۲۔ آپ کے یہاں سے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب جنھوں نے آپ کے جلسہ کی صدارت فرمائی تھی ان سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا مجھے میری زندگی میں پہلی بار ایسے مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا جو علم جدید پر بھی گہرائی سے نظر رکھتے ہیں اور جدید اسلوب میں پیغمبر انقلاب جیسی گراں قدر تصنیف امت مسلمہ کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے آپ نے جامع مسجد میں بروز جمعہ بعد نماز عشاء سورہ "الم نشرح" پر اپنے جو زرین خیالات پیش کیے تو لوگوں کی طبیعت بعد تقریر ختم ہونے پر بھی اٹھنے کو نہیں چاہ رہی تھی۔ خود میری بھی یہی حالت تھی حالاں کہ میں آپ کے ساتھ کئی سالوں سے ہوں۔ الرسالہ (اپریل ۱۹۸۶) آج ہی ملا۔ صفحہ نمبر ۱۰ پر عورت کے بارہ میں پڑھا تو میرا دل اچھلنے لگا جسے آپ انگریزی میں تھرل کہتے ہیں۔ بس ایسی ہی کیفیت گزری۔ اگر لوگوں کا مجھے پاگل سمجھنے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں مزدور دکان بند کر کے ناچنا شروع کر دیتا۔ سچ مچ آج تک ایسی قرآن کی تشریح پڑھنے میں نہیں آئی۔ جس کسی نے بھی یہ مضمون پڑھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں یہ بات محض اپنی عقیدت مندی کی وجہ سے نہیں لکھ رہا ہوں اور نہ ہی آپ کا میرا

پیری مریدی والا معاملہ ہے کہ صرف آپ کو خوش رکھنے کے لیے کہوں۔ میں نے پایا کہ آپ میں تضاد نہیں ہے جو بات آپ نے مجھ سے اکیلے میں کہی وہی بات ہزاروں لوگوں میں بھی کہی ہے۔ یہی خلوت اور جلوت کی یکسانیت مجھے آپ سے عقیدت اور محبت پر مجبور کرتی ہے جو میرے نزدیک عین اسلامی تقاضہ ہے۔ (۲ اپریل ۱۹۸۶)

۱۳۔ محترم! پچھلے چند مہینے قبل آپ کی دو کتابیں ختم کیں۔ ایک "مذہب اور جدید چیلنج" اور دوسری کتاب "پیغمبر انقلاب"۔ دونوں ہی کتابوں نے ذہن و دل پر گہرے نقوش چھوڑے مولانا آپ یقین کریں مذہب اور جدید چیلنج پڑھنے کے بعد معاً یہ خیال بھی میرے دل میں آیا کہ اگر میرے پاس ایک کروڑ روپے ہوتے تو میں اس کتاب کا ہندستان کی ہر زبان میں ترجمہ کرواتا اور ہاتھوں ہاتھ مفت تقسیم کروادیتا۔ اب اکثر نمازوں میں اور بالخصوص جمعہ کی نماز کے بعد آپ کے حق میں یہ دعا دل سے نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو قائم و دائم رکھے۔ انگریزی کا الرسالہ جب سے نکلنے لگا ہے میری مشکل حل ہوگئی ہے۔ اکثر اپنے غیر مسلم دوستوں کو مطالعہ کے لیے دے دیتا ہوں۔ پچھلے دنوں شاہ بانو کیس کے سلسلے میں ہمارے شہر میں ایک احتجاجی جلوس منتر الیہ لے جایا گیا تھا اور مسلم پرسنل لاء پر شہر کے ہر اخبار میں لکھا گیا تھا۔ اس قسم کے ہنگاموں سے غیر مسلموں پر برا اثر پڑتا ہے۔ وہ اور زیادہ مشکوک انداز میں دیکھنے لگتے ہیں۔ میرا ایک قریبی غیر مسلم دوست ایک بار میرے پاس آیا اور پھر پرسنل لا اور اس جلوس کے خلاف اول فول کہنے لگا۔ میں پہلے تو اس کی باتیں سنتا رہا پھر بات سمجھانے کے لیے انگریزی الرسالہ جنوری اسے پڑھنے کے لیے دیا۔ اس کے بعد اس پر خاموشی طاری ہوگئی۔ مسلم پرسنل لا طلاق اور نکاح سے متعلق جو باتیں آپ نے لکھی ہیں وہ کسی اسلامی مفکر، دانش ور، کے یہاں نظر نہیں آئیں۔ (۲۲ فروری ۱۹۸۶)

۱۴۔ تذکیر القرآن کی ترتیب خدا کے فضل سے ۲۷ ویں پارہ تک پہونچ گئی ہے۔ ساتھ ساتھ کتابت بھی ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ اس کی دوسری جلد عنقریب شائع ہو جائے گی۔

۱۵۔ "حقیقتِ حج" کا نیا اڈیشن زیر طبع ہے۔ مزید اضافوں کے بعد وہ ایک سو سے زیادہ صفحات کا ہو گیا ہے۔ نئے اڈیشن میں تصاویر بھی شامل ہیں۔

ایک گزارش

اسلامی مرکز کے تحت تعمیر ملّت اور احیار اسلام کا جو کام ہو رہا ہے وہ خدا کے فضل سے کافی پھیل چکا ہے۔ مگر اسلامی مرکز کے پاس آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں۔ اس کا کام اب تک ہمدردوں اور متفقین کے تعاون سے چل رہا ہے۔

آپ سے ہماری گزارش ہے کہ آپ اس دینی تعاون میں اپنا حصہ ادا فرمائیں۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی اشاعت خدا کے فضل سے کافی بڑھ چکی ہے۔ مگر قیمت کم رکھنے کی وجہ سے عملاً وہ خسارہ پر چل رہا ہے۔ اشاعت میں اضافہ صرف اس کے خسارہ میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی تلافی کی واحد صورت یہی ہے کہ اصحاب خیر اپنے تعاون سے اس کے نقصان کو پورا فرمائیں۔ مزید نئی دعوتی اسکیموں کو شروع کرنے کا مسئلہ اس کے علاوہ ہے۔ ان کاموں کے لیے مختلف مد کی رقمیں بھیجی جا سکتی ہیں۔ آپ اپنی رقم بھیجتے ہوئے صراحت فرما دیں کہ وہ کس مد کی رقم ہے۔

وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1 الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی ثانین خاں پرنٹر پبلشر مسئول بجنور کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز

عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحید الدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ	ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ	سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی	۲۵ ڈالر امریکی	۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

June 1986
Number 115

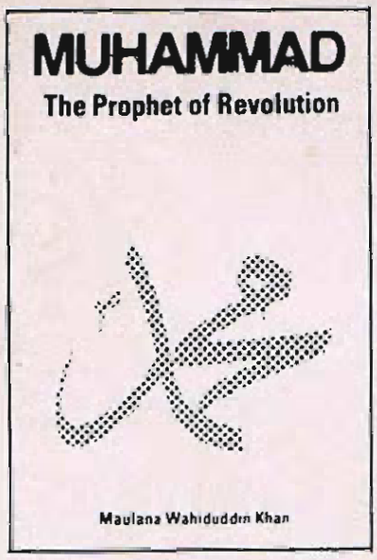

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013